Regd. L. No.7243

Phone, 80800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ستمبر 1974

۶ ستمبر ۱۹۶۵ء

شہدائے پاکستان

اس انتظار میں ہیں کہ ہم ان کے خون کی

قیمت کب ادا کرتے ہیں۔

شائع کردہ ادارۂ طلوعِ اسلام - ۲۵ بی - گلبرگ - لاہور ۹

قیمت فی پرچہ

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

بدلِ اشتراک

پاکستان سالانہ ۱۵ روپے

غیر ممالک سالانہ ۱½ پونڈ

ٹیلی فون

۸۰۸۰۰

خط و کتابت

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور

قیمت

فی پرچہ ۱½ روپیہ

جلد ۲۷	ستمبر ۱۹۷۴ء	نمبر ۹

فہرست

۱۔ لمعات ---------- ۲

۲۔ جنگ ترکی و یونان ... علامہ اقبالؒ ---------- ۱۵، ۱۶

۳۔ پاکستان کا ازلی دشمن (خطاب)۔ محترم پرویز صاحب ---------- ۱۷

۴۔ باب المراسلات :- ---------- ۴۵

۱۔ سیکولر حکومت کسے کہتے ہیں؟ ۲۔ کچھ "چھٹی حس" کے بارے میں

۳۔ تحقیق طلب مسائل ۔ ۴۔ شیعہ حضرات اور تحریف فی القرآن۔

۵۔ رسمِ جہیز ۔ پروفیسر رفیع اللہ شہاب ۵۲

۶۔ مجلسِ مذاکرہ ۔ ۱۔ عزیزان نجمہ صفدر۔ گوگی رانی۔ سلمیٰ پرویز ۵۹

ایڈیٹر محمد خلیل، ناشر سراج الحق۔ مقام اشاعت: ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور۔ پرنٹر: محمد محسن۔ لاہور آرٹ پریس انارکلی لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

لمعات

نیشنل عوامی پارٹی کے سربراہ خان عبدالولی خان (آف سرحد) کے ساتھ اسقدر سیاسی اختلاف کے باوجود ان کے متعلق ہمیں اتنا حسن ظن ضرور تھا کہ وہ منجھے ہوئے سیاستدان اور (ہمارے نقطۂ نگاہ سے غلط ہی سہی) پختہ فکر کے انسان ہیں۔ لیکن گذشتہ جولائی میں انہوں نے اپنی پریس کانفرنس میں ایک ایسی بات کہی جس سے ہمارا یہ حسن ظن بھی جاتا رہا۔ جب ان پر اعتراض کیا گیا کہ وہ علیحدگی کا مسلک کیوں اختیار کرنا چاہتے ہیں، تو انہوں نے جواب میں کہا کہ علیحدگی کا مسلک کوئی انوکھا مسلک نہیں۔

خود قائدِ اعظمؒ علیحدگی کی تحریک کے بانی تھے۔ انہوں نے ہندوستان سے علیحدگی اختیار کی اب اگر کوئی اور قائدِ اعظمؒ کے پیرو کار بنتے ہیں تو سزاوار ٹھہرتے ہیں۔[1]

(نوائے وقت ۲۰ جولائی ۱۹۷۲ء)

ولی خان صاحب نے یہ کہہ کر اسلام، نظریہ پاکستان اور قائدِ اعظمؒ کے مسلک کے متعلق اپنی عدم واقفیت (یا مغالطہ آفرینی) کا ثبوت دیا ہی تھا، لیکن جن لوگوں نے قائدِ اعظمؒ کی مدافعت میں "صفائی" پیش کی ہے انہوں نے بھی ان سے کم بے خبری کا ثبوت نہیں دیا۔ ان کے جواب دیکھ کر بے ساختہ یہ مقولہ زبان پر آگیا کہ خدا مجھے میرے دوستوں سے بچائے۔ انہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ قائدِ اعظمؒ کا مسلک علیحدگی تھا ہی نہیں یہ بہت بڑا الزام ہے جو ان کے سر تھوپا جا رہا ہے۔ ناطقہ سر بگریباں کہ اُسے کیا کہیئے۔ ایسے ہی وہ مقامات ہیں جہاں پہنچ کر یہ تلخ حقیقت بار بار سامنے آتی ہے کہ نظریہ پاکستان یا مسلک قائدِ اعظمؒ کو اتنا نقصان ان کے دانا دشمنوں نے نہیں پہنچایا جتنا اُن کے نادان دوستوں نے پہنچایا ہے، اور یہ جو ہماری نئی نسل تحریک پاکستان کی اصل دغایت سے اس قدر ناواقف (بلکہ اب تو یوں کہیئے کہ اسقدر مخالف ہے تو اس کے بیشتر ذمہ دار قائدِ اعظم کے ہی نادان دوست ہیں آیئے ہم دیکھیں کہ قائدِ اعظم کا مسلک کیا تھا، اسلامی نقطۂ نگاہ سے وہ مسلک کیسا تھا، اور ولی خان صاحب جو کچھ فرما رہے ہیں اس کی حقیقت کیا ہے؟

۲۔ ایک فقرہ میں ساری حقیقت یوں بتائی جا سکتی ہے کہ قرآن مجید کی رُو سے اسلام کا منتہیٰ پوری نوعِ انسان کو ایک عالمگیر برادری کے قالب میں ڈھال دینا ہے۔ اس کے لئے اس کا طریق کار "علیحدگی" ہے وہ کہتا ہے کہ اس قسم کی وحدت کی عمارت ہم آہنگ فکر و نظر کی بنیادوں پر استوار کی جا سکتی ہے۔ (جسے اصطلاح میں

---

[1] بعض خبروں میں آیا ہے کہ ولی خان صاحب نے کہا ہے کہ انہوں نے قائدِ اعظم کے متعلق یہ الفاظ استعمال نہیں کئے تھے لیکن جو کچھ ہم نے آئندہ سطور میں لکھا ہے اس سے اس میں کچھ فرق نہیں پڑتا۔ ولی خان صاحب بہرحال صوبائی یا نسلی بنیاد پر علیحدہ قومیت کے داعی ہیں اور ان کا یہی وہ نظریہ علیحدگی ہے جو ہمارے زیرِ تنقید ہے۔

ایمان کہا جاتا ہے)۔ اس کے برعکس وہ لوگ ہیں جو نسل، رنگ، خون، زبان یا وطن کی بنیادوں پر نوعِ انسانی کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا اور انہیں مختلف گروہوں میں منقسم رکھنا چاہتے ہیں۔ قرآن مجید وحدتِ انسانیت کے پروگرام کی ابتدا اس طرح سے کرنا چاہتا ہے کہ جو لوگ اس نظریہ اور نصب العین پر یقین رکھیں انہیں اُن لوگوں سے الگ کر لیا جائے جو اس کی مخالفت سے نوعِ انسان کو ٹکڑوں میں منقسم رکھنا چاہتے ہیں۔ اس طرح نوعِ انسان ابتداءً دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے قرآن مجید کا ارشاد ہے:۔

هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ فَمِنكُمْ كَافِرٌ وَمِنكُم مُّؤْمِنٌ ۚ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ (64/2)

خدا نے تمہیں پیدا کیا۔ پھر تم میں سے کچھ لوگوں نے حق و صداقت سے انکار اور سرکشی کا مسلک اختیار کر لیا۔ انہیں کافر کہا جاتا ہے اور دوسرے ان صداقتوں کو صحیح مان کر ان پر عمل پیرا ہو گئے۔ انہیں مومن کہہ کر پکارا جاتا ہے یہ تقسیم ازلی اور ابدی ہے اور خود تمہارے اپنے اعمال کے مطابق عمل میں آتی ہے۔ جو خدا کی نگاہ میں ہوتے ہیں۔

آپ نے دیکھا کہ اسلام کی بنیاد تفریق اور علیحدگی پر ہے جسے وہ وحدتِ انسانیت کے منتہیٰ تک پہنچنے کے لئے قدمِ اوّل قرار دیتا ہے۔ چنانچہ اسلام کے پیروکار روزِ اوّل سے اس علیحدگی کے پروگرام پر عمل پیرا ہیں اس کا آغاز سلسلۂ انبیاء کرامؑ کی سب سے پہلی کڑی، حضرت نوح علیہ السلام سے ہوتا ہے۔ نسل، زبان، وطن کے اشتراک کی بنا پر یگانگت کی بیّن اور ناقابلِ تردید مثال باپ بیٹے کا رشتہ ہے۔ آپ دیکھئے کہ دین کی مذکورہ صدر وجہ جامعیت نے اس رشتہ کو بھی کس طرح منقطع کر کے رکھ دیا۔ باپ (حضرت نوحؑ) اس اصول کا داعی تھا، اور بیٹا اس کا مخالف۔ جب حضرت نوحؑ اپنی ہم آہنگ جماعت کے ساتھ کشتی میں سوار ہوئے تو بیٹے سے کہا کہ تم بھی آجاؤ۔ وَلَا تَكُن مَّعَ الْكَافِرِينَ (11/42) کفار کے گروہ کے ساتھ نہ رہو لیکن اس نے ان کا ساتھ نہ چھوڑا اور ڈوب گیا۔ جب وہ ڈوب گیا تو حضرت نوحؑ نے بحضور رب العزت عرض کیا کہ آپ نے تو کہا تھا کہ تیرے اپنے "محفوظ رہیں گے" تو میرا بیٹا جو میرے اپنوں میں سرِ فہرست تھا وہ کیوں ڈوب گیا۔ تو جواب ملا کہ نوح! إِنَّهُ لَيْسَ مِنْ أَهْلِكَ (11/46) وہ تیرے اپنوں میں سے نہیں تھا۔ یہاں اپنوں اور غیروں کا معیار خون کا رشتہ نہیں۔ نظریہ (ایمان) کی ہم آہنگی ہے۔ یہ علیحدگی کی پہلی مثال تھی جسے اس طرح سامنے لایا گیا۔ اور مثال بھی ایسی جس کے سمجھنے میں ذرا بھی دقت نہ ہو۔ یعنی اس حقیقت کے سمجھنے میں کہ جب دین کے اختلاف کی بنا پر حقیقی بیٹا بھی اپنوں میں سے نہیں ہو سکتا تا بدیگراں چہ رسد نسلی رشتوں کے بعد بیوی کا رشتہ سامنے آتا ہے حضرت نوحؑ کی بیوی بھی ایمان میں اُن سے ہم آہنگ نہیں تھی۔ اس لئے اس کے متعلق کہہ دیا گیا کہ وہ تمہارے اہل میں سے نہیں ہے۔

اس کے بعد ہمارے سامنے ملّتِ اسلامیہ کے موسّسِ اعلیٰ حضرت ابراہیمؑ آتے ہیں جنہوں نے اس باب میں ایسا نکھرا اور ابھرا ہوا طرزِ عمل پیش کیا کہ قرآن کریم نے اُسے تمام اہلِ ایمان کے لئے اُسوۂ حسنہ بہترین نمونہ کہہ کر پکارا ہے۔ ان کے والد ایمان کے سلسلہ میں ان سے ہم آہنگ نہیں تھے۔ انہوں نے پہلے

انہیں سمجھایا لیکن وہ زمانے اُن کی قوم بھی ان کی مخالف تھی۔ انہوں نے مختلف طریقوں سے اسے بھی سمجھانے کی کوشش کی، لیکن وہ بھی اپنی روش کو چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوئی تو آپ نے باپ اور قوم سب سے برملا کہہ دیا کہ وَاَعْتَزِلُكُمْ (۱۹/۴۸) اگر صورت یہی ہے تو میں تم سے الگ ہوتا ہوں۔ میرا تم سے کوئی تعلق نہیں اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (میں ہی نہیں، بلکہ میں اور میرے ساتھی ہم سب تم سے اور جن کی تم خدا کو چھوڑ کر عبودیت اختیار کرتے ہو، اور سب سے لاتعلق ہیں كَفَرْنَا بِكُمْ ہم تم سے ہر رشتے کا انکار کرتے ہیں اور بیزاری کا اعلان کرتے ہیں وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا۔ تم میں اور ہم میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کھلی کھلی عداوت اور نفرت رہیگی۔ اگر تم چاہتے ہو کہ ہم سے تعلق پیدا کرو اور یہ عداوت اور نفرت محبت اور یگانگت میں تبدیل ہو جائے، تو اس کا ایک اور صرف ایک طریقہ ہے اور وہ یہ کہ تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ (۶۰/۴) تم بھی خدائے واحد کے عطا فرمودہ، ابدی اصولوں پر ایمان لے آؤ، اگر تم اس کے لئے تیار نہیں، تو یہ رہے خون، نسل، زبان، وطن کے تمہارے رشتے اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّیْ (۳۷/۹۹) میں چلا اُس فضا کی طرف جہاں اپنائیت کا معیار خدا کا مقرر کردہ اصول ہے نہ کہ انسانوں کی خود ساختہ نسبتیں۔ انہوں نے کہا کہ ابراہیم! تم تو ہم میں سے تھے۔ ہمارے اپنے تھے۔ پھر یہ اس قدر بیگانگی اور قطع علائق کیوں؟ فرمایا کہ یہ تمہاری بھول ہے کہ میں تمہارا اپنا تھا یا تم میرے اپنے۔ اچھی طرح سُن رکھو۔ فَمَنْ تَبِعَنِیْ فَاِنَّهٗ مِنِّیْ ج (۱۴/۳۶) جو شخص خدا کی بتائی ہوئی راہ میں میرے پیچھے پیچھے چلتا ہے وہ کسی قبیلہ کا فرد اور کسی وطن کا باشندہ ہو، وہ میرے اپنوں میں سے ہے اور جنہیں تم میرے اپنے کہتے ہو اگر وہ کسی دوسرے راستے پر چلتے ہیں تو وہ میرے اپنے نہیں غیر ہیں۔ ان سے یہ کہا اور پھر "اپنوں" کو ساتھ لے کر ان "بیگانوں" سے الگ ہو گئے۔ یہ تھا حضرت ابراہیمؑ اور اُن کے ساتھیوں کا وہ فیصلہ اور کردار علیحدگی جسے قرآن مجید نے اُمتِ مسلمہ کے لئے اسوۂ حسنہ۔ بہترین نمونہ قرار دیا ہے (۶۰/۴) اسی معیار کے مطابق حضرت لوطؑ کی بیوی کے متعلق بھی کہہ دیا کہ وہ بھی حضرت لوطؑ کے اپنوں میں سے نہیں، غیروں میں سے تھی کہ وہ ایمان میں حضرت لوطؑ کی ہم رشتہ نہیں تھی (۶۶/۱۰-۱۱)

حضرت عیسےٰ علیہ السلام کے متعلق عام طور پر سمجھا جاتا ہے (اور عیسائی ایسا ہی مشہور کرتے ہیں) کہ ان کی تعلیم صلح کل کی تھی۔ وہ انسانوں میں تفریق پیدا کرنے کے قائل نہیں تھے۔ لیکن یہ غلط ہے۔ خود انجیل میں ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ:

> کہ یہ نہ سمجھو کہ میں زمین میں صلح کرانے آیا ہوں، صلح کرانے نہیں بلکہ تلوار چلوانے آیا ہوں۔ میں اس لئے آیا ہوں کہ آدمی کو اس کے باپ سے اور بیٹی کو اس کی ماں سے اور بہو کو اس کی ساس سے جدا کر دوں اور آدمی کے دشمن اس کے گھر ہی کے لوگ ہوں گے۔ جو کوئی باپ یا ماں کو مجھ سے زیادہ عزیز رکھتا ہے وہ میرے لائق نہیں اور جو کوئی بیٹے یا بیٹی کو مجھ سے زیادہ عزیز رکھتا ہے وہ بھی میرے لائق نہیں۔ اور جو کوئی اپنی صلیب نہ اٹھائے اور میرے پیچھے نہ

چلے وہ بھی میرے لائق نہیں۔ (متی 15 / 34-38)

اور پھر جب وہ نبی آخرالزمانؐ آگیا جس کی طرف وحی خداوندی نے دین کو مکمل کر دیا، جس کے اسوۂ حسنہ نے خدا کے متعین فرمودہ اصول کی رُو سے انسانوں کی اس تفریق و تقسیم کو اس طرح نمایاں کر کے رکھ دیا کہ اس میں نہ کسی قسم کا ابہام رہا نہ التباس۔ نہ شک رہا نہ ریب۔ حضورؐ نے ایک ایسی اُمت کی تشکیل فرمائی جس میں حبش کا بلالؓ روم کا صہیبؓ، فارس کا سلمانؓ، اشتراکِ ایمان کی بنا پر حضورؐ کی اپنی اُمت کے افراد تھے اور مکہ کا ابوجہل اور حضورؐ کا حقیقی چچا ابولہب، خون، رنگ، نسل، زبان، وطن کے اشتراک کے باوجود ایک دوسری قوم کے افراد، یگانگت اور بیگانگی کے اصولی معیار کا یہی وہ عملی مظاہرہ تھا جو بدر کے میدان میں کھل کر سامنے آگیا جب دنیا نے دیکھا حضرت ابوبکرؓ ایک طرف تھے اور اُن کا بیٹا بالمقابل دوسری صف میں۔ حضرت عمرؓ ایک طرف تھے تو ان کا ماموں دوسری طرف حضرت علیؓ ادھر تھے اور ان کا بھائی عقیل اُدھر۔ حضرت حذیفہؓ ادھر تھے اور اُن کا باپ عتبہ دوسری طرف اور آگے بڑھیے۔ حضور نبی اکرم (محمدؐ) ادھر تھے اور آپ کا حقیقی چچا عباس اور داماد ابوالعاص دوسری طرف آپ کے مدمقابل یہ تھی وہ تفریق و تقسیم جو وطن، رنگ، زبان نسل، رشتہ داری کے تمام حدود و ثغور سے بلند ہو کر خالص ایمان اور کفر کے معیار پر وجود میں آئی تھی۔ (اسی کو دو قومی نظریہ کہتے ہیں) سوچئے کہ اس سے بڑی علیحدگی کی مثال کوئی اور بھی ہو سکتی ہے؟ یہی وہ علیحدگی تھی جس کی بنا پر معرکۂ بدر کو یوم الفرقان کہہ کر پکارا گیا ہے۔ یعنی وہ میزان جس میں اشتراک و اختلافِ نظریہ کی بنا پر علیحدگی نمایاں طور پر سامنے آگئی تھی۔ یہی وہ علیحدگی تھی جس کی بنا پر کہہ دیا گیا تھا کہ ایمان کے رشتہ میں منسلک افراد بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ (۹/۷۱) ایک دوسرے کے دوست اور چارہ ساز ہیں اور ان کے مقابلہ میں دوسرے گروہ (کفار) کے افراد بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ (۸/۷۳) ایک دوسرے کے دوست۔ اور اس کے بعد اس جماعت مومنین کو تاکید کر دی گئی کہ لَا تَتَّخِذُوا بِطَانَةً مِّن دُونِكُمْ اے جماعت مومنین! تم اپنوں کے سوا کسی اور کو اپنا ہمراز نہ بناؤ لَا يَأْلُونَكُمْ خَبَالًا یہ تمہاری تخریب میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھیں گے وَدُّوا مَا عَنِتُّمْ ان کی دلی خواہش ہوتی ہے کہ تم کسی نہ کسی مصیبت میں پھنسے رہو قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاءُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِي صُدُورُهُمْ أَكْبَرُ ان کی بغض و عداوت کی بعض باتیں تو بے ساختہ اُن کی زبان پر آجاتی ہیں لیکن جو کچھ ان کے سینوں میں چھپا ہوتا ہے وہ اس سے کہیں بڑھ کر ہوتا ہے قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْآيَاتِ إِن كُنتُمْ تَعْقِلُونَ (۳/۱۱۸) ہم نے تمہیں ان حقائق سے واضح طور پر آگاہ کر دیا ہے۔ اگر تم عقل و فکر سے کام لو گے تو تم زندگی کے صحیح راستے پر چلتے رہو گے۔ یاد رکھو اس دوسرے گروہ کی حالت یہ ہے۔ إِن تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ۔ اگر کوئی بات تمہارے فائدے کی ہوتی ہے تو اس سے انہیں بڑا صدمہ ہوتا ہے وَإِن تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَفْرَحُوا بِهَا (۳/۱۱۹) اگر تمہیں کوئی نقصان پہنچتا ہے تو اس سے یہ بہت خوش ہوتے ہیں۔

یہ ہے قرآن کریم کی تعلیم۔ کہیئے یہ اُن لوگوں سے علیحدگی کی تعلیم ہے جو نسل یا وطن کو وجہ جامعیت

قرار دیں، یا ان کے ساتھ مل کر "متحدہ قومیت" بنانے کی تعلیم؟ قرآن کریم کی یہی وہ تعلیم تھی جس کی رُو سے قائدِ اعظمؒ نے ہندوؤں سے علیحدگی اور اسلام کے اشتراک کی بناء پر مسلمانوں کی ایک جداگانہ قومیت کا مسلک اختیار کیا اور اسے تحریکِ پاکستان کی بنیاد قرار دیا۔ سُنیئے کہ انہوں نے کفر اور اسلام کو وجۂ تفریق قرار دیتے ہوئے کس قدر مختصر لیکن جامع اور اس کے ساتھ ہی واشگاف الفاظ میں اعلان فرمایا کہ

> پاکستان اسی دن وجود میں آگیا تھا جب ہندوستان میں پہلا غیر مسلم مسلمان ہوا تھا اور یہ اُس زمانے کی بات ہے جب یہاں ہنوز مسلمانوں کی حکومت بھی قائم نہیں ہوئی تھی
>
> (علی گڑھ کی تقریر ۸ر مارچ ۱۹۴۴ء)

ہندوستان میں جس دن پہلا غیر مسلم مسلمان ہوا تھا اُس دن کیا انقلاب ظہور میں آیا تھا؟ یہ کہ اُس دن وہ تفریق اور علیحدگی عملی طور پر سامنے آگئی تھی۔ جس کی بنیاد کفر اور اسلام پر تھی اور جس سے دو قوموں کے وجود کی پہلی اینٹ رکھی گئی تھی۔ یہ وہی اختلاف تھا جو اُس دن ظہور میں آیا تھا۔ جب مکہ میں پہلا غیر مسلم مسلمان ہوا تھا، جو ایک جداگانہ اُمت کی تشکیل کی خشتِ اوّل تھی اور جس سے مدینہ کی مملکت کی بنیاد رکھ دی گئی تھی۔ قائدِ اعظمؒ کی ساری تگ و تاز کا محور اسی علیحدگی کا نظریہ تھا۔ وہ ۱۹۴۷ء تک اسی کا اعلان کرتے رہے تاآنکہ اس نظریہ کا عملی نتیجہ یعنی مسلمانوں کی جداگانہ مملکت کا وجود عمل میں آگیا۔

قائدِ اعظمؒ کے مدِ مقابل ہندو لیڈر مسٹر گاندھی تھے۔ ان کا دعوےٰ یہ تھا کہ:-

> میں تاریخ میں اِس کی مثال نہیں پاتا کہ کچھ لوگ جنہوں نے اپنے آباؤ اجداد کا مذہب چھوڑ کر ایک نیا مذہب قبول کر لیا ہو، وہ اور ان کی اولاد یہ دعوےٰ کریں کہ وہ اپنے آباؤ اجداد سے الگ قوم بن گئے ہیں۔ اگر ہندوستان مسلمانوں کی آمد سے پہلے ایک قوم تھا تو اسلام کے بعد بھی اسے ایک قوم رہنا چاہیئے خواہ اس کے سپوتوں میں سے ایک کثیر تعداد نے اسلام قبول کر لیا ہو۔ (قائدِ اعظمؒ کے نام خط ۱۵-۹-۴۴)

مسٹر گاندھی (اور ان کے ہم نواؤں) کی یہ غلط فہمی یا مغالطہ آفرینی تھی کہ انہوں نے اسلام کو بھی (ہندومت کی طرح) ایک "مذہب" تصور کر رکھا تھا حالانکہ یہ مذہب تھا ہی نہیں۔ یہ دین تھا۔ مذہب فی الواقعہ الگ قومیت کا مدار نہیں بنتا، لیکن دین کا فطری نتیجہ ایک الگ قومیت کی تشکیل ہوتا ہے۔ دین اور مذہب کے اس فرق کی وضاحت کرتے ہوئے قائدِ اعظمؒ نے اپنے ۱۹۴۵ء کے مشہور خطبۂ صدارت میں کہا تھا کہ:-

> میرے لئے یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ آخر ہمارے ہندو بھائی اسلام اور ہندومت کی حقیقت اور اہمیت کے سمجھنے سے کیوں گریز کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں مذہب نہیں بلکہ ایک دوسرے سے مختلف معاشرتی نظام ہیں اور اسی بناء پر متحدہ قومیت کا تخیل ایک ایسا خواب ہے۔ جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ یاد رکھیئے! ہندو اور مسلمان مذہب کے

معاملہ میں دو جداگانہ فلسفے رکھتے ہیں۔ دونوں کی معاشرت ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ یہ دو الگ الگ تہذیبوں سے تعلق رکھتے ہیں جن کی بنیادیں متضاد تصورات پر ہیں۔ دو ایسی قوموں کو ایک مملکت میں یکجا کر دینا باہمی مناقشت کو بڑھائے گا اور بالآخر اس نظام کو پاش پاش کر کے رکھ دے گا جو اس مملکت کی حکومت کے لئے وضع کیا گیا ہو۔

اس بنیادی حقیقت کی مزید وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے اگلے ہی سال اپنے خطبہ مدراس میں فرمایا:-

مسلم لیگ کا نصب العین یہ بنیادی اصول ہے کہ ہندوستان کے مسلمان ایک جداگانہ قومیت رکھتے ہیں انہیں کسی دوسری قوم میں جذب کرنے یا ان کے نظریات اور ملی تشخص کو مٹانے کے لئے جو کوشش بھی کی جائے گی اس کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے گا۔ ہم نے تہیہ کر لیا ہے کہ ہم اپنے جداگانہ قومی تشخص اور جداگانہ حکومت کو قائم کریں گے۔

انہوں نے (۲ مارچ ۱۹۴۱ء کو) پنجاب سٹوڈنٹس فیڈریشن کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

میں نہیں سمجھتا کہ کوئی دیانتدار آدمی اس حقیقت سے انکار کر سکتا ہے کہ مسلمان بجائے خویش ہندوؤں سے الگ مستقل قوم ہیں۔

اور انہوں نے (۲۷ نومبر ۱۹۴۵ء کو) ایڈورڈز کالج پشاور میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے بنیادی اختلافات کا ذکر کرتے ہوئے کہا:-

ہم دونوں میں صرف مذہب کا فرق نہیں۔ ہمارا کلچر بھی ایک دوسرے سے الگ ہے۔ ہمارا دین ہمیں ایسا ضابطۂ حیات دیتا ہے جو زندگی کے ہر شعبہ میں ہماری راہنمائی کرتا ہے ہم اسی ضابطہ کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔

قائداعظمؒ علیحدگی کے اس قرآنی تصور کو، جو ہمارے دین کی بنیادی حقیقت ہے، عام کرتے چلے گئے ہندو نے تو اسے نہ سمجھنا تھا نہ سمجھا۔ اس لئے کہ وہ دین اور مذہب کے فرق کو سمجھ ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ مذہب پرست واقع ہوا تھا۔ دین کا یہ تصور اس کے سامنے پہلی بار آیا تھا۔ اور کچھ اس لئے کہ اس کی سیاسی مصلحتوں کا تقاضا تھا کہ ہندوستان کے تمام باشندوں کو ایک قوم قرار دیا جائے تاکہ وہ اپنی عددی اکثریت کی بنا پر مسلمانوں پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے حکومت کرتے رہیں لیکن۔ مقام صد حیرت تھا کہ خود مسلمانوں کے قوم پرست لیڈر اور بالائے حیرت کہ نیشنلسٹ علماء کا گروہ بھی اس باب میں ہندوؤں کا ہمنوا تھا۔ علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ کے پیش کردہ اس تصورِ قومیت کی سب سے زیادہ شدید مخالفت اسی طبقہ کی طرف سے ہوئی تھی۔ وہ بھی اسلام کو باقی مذاہب کی طرح ایک مذہب قرار دیتے تھے اور کہتے تھے کہ مذہب بنیادِ قومیت نہیں بن سکتا چنانچہ اس معرکہ "دین و وطن" میں مسلم لیگ کی مخالفت میں ہندو تو پیچھے پیچھے تھا اور اگلی صفوں

ہیں مسلمان قومیت پرست لیڈر تھے اور ان کا ہراول دستہ نیشنلسٹ علماء! اسی حیرت افروز و جگر پاش منظر کو دیکھ کر علامہ اقبالؒ پکار اٹھے تھے کہ:

چنیں دورِ آسماں کم دیدہ باشد … کہ جبریلِ امیں را دل خراشد

چہ خوش دیرے بنا کردند آنجا … پرستد مومن و کافر تراشد

یعنی نظریہ وطنیت ہندو کی مصلحت کوشیوں کا وضع کردہ ہے اور مسلمان علماء اس یکسر خلاف اسلام نظریہ کو عین اسلام قرار دے کر پیش کر رہے ہیں (مولانا) ابوالکلام آزاد (مرحوم) نے قرآن کی تفسیر یہ ثابت کرنے کے لئے لکھ دی کہ اسلام کو دیگر مذاہب پر کوئی افضلیت حاصل نہیں "عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں" (ترجمان القرآن تفسیر سورہ فاتحہ)

انہوں نے کانگرس کا صدر منتخب ہونے کے بعد اپنی پہلی تقریر لاہور میں فرمایا کہ "مسٹر جناحؒ کا یہ نظریہ کہ ہندوستان میں ہندو اور مسلمان دو جداگانہ قومیں ہیں غلط فہمی پر مبنی ہے" (اسٹیٹسمین ۴۰-۲-۱۹)

دوسری طرف دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث، مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) یہ کہہ کر علامہ اقبالؒ کے مدِ مقابل کھڑے ہو گئے تھے کہ "قومیں اوطان سے بنتی ہیں دین کے اشتراک سے نہیں"

مسٹر گاندھی کہتے تھے کہ مسٹر جناحؒ خواہ مخواہ مذہب کو سیاست میں گھسیٹ لائے ہیں۔ مذہب ہر ایک کا شخصی اور داخلی معاملہ ہے۔ اسے سیاست سے کیا واسطہ اور مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) اور ان کے ہمنوا نیشنلسٹ علماء کا ارشاد تھا کہ ہندو یقین دلاتا ہے کہ آزادیٔ ہند کے بعد مسلمانوں کو ان کے اعتقادات، عبادات اور شخصی قوانین کی پوری پوری آزادی ہو گی اور ملکی قوانین جمہوری طریق پر وضع کئے جائیں گے۔ یہ مسلک جسے سیکولرازم کہا جاتا ہے اسلام کے قطعاً خلاف نہیں۔ طبقۂ علماء سے باہر، متحدہ قومیت اور سیکولرازم کے سب سے بڑے حامی خان عبدالغفار خان صاحب تھے جو اپنا نام تک چھوڑ کر سرحدی گاندھی کہلانا زیادہ پسند فرماتے تھے۔ ان کی مخالفت کی شدت کا یہ عالم تھا کہ جب اصولی طور پر یہ طے ہو گیا اور ہندو بھی اس پر رضامند ہو گیا کہ مسلمان اکثریت کے علاقے ہندوستان سے الگ کر دیئے جائیں تو انہوں نے اس وقت بھی اپنی مخالفت کو نہ چھوڑا اور یہ تجویز پیش کر دی کہ صوبہ سرحد میں، جہاں مسلمان اکثریت سب سے زیادہ تھی، ریفرنڈم کرایا جائے جس میں نقطۂ استصواب یہ ہو کہ سرحد کے مسلمان ہندوستان کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں یا پاکستان کے ساتھ، یا باقی مسلمانوں سے الگ اپنی جداگانہ آزاد مملکت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ یعنی سرحدی گاندھی صاحب پہلے تو یہ کوشش کرتے رہے کہ ہندوستان کے مسلمان ہندوؤں سے علیحدہ نہ ہونے پائیں لیکن جب اپنی اس کوشش میں ناکام رہ گئے تو یہ شرط پیش کر دی کہ سرحد کے مسلمان باقی مسلمانوں سے علیحدہ ہو جائیں یعنی سرحد کے مسلمان ہندوؤں کے ساتھ مل کر تو رہ سکتے تھے لیکن مسلمانوں کے ساتھ مل کر نہیں۔ بالفاظِ دیگر، خان صاحب ہندوؤں سے علیحدگی کے تو سخت مخالف تھے لیکن مسلمانوں سے علیحدگی کا مطالبہ پیش فرما رہے تھے (آپ اس نقطہ کو اچھی طرح ذہن میں رکھیں۔

کیونکہ عبدالغفار خان صاحب کے صاحبزادے خان عبدالولی خان وہی مطالبہ اب یہاں پیش کر رہے ہیں جسے اُن کے والد بزرگوار نے پیش کیا تھا)

تصریحات بالا سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ قائدِ اعظمؒ کا مسلک علیحدگی عین اسلام کا تقاضا تھا یعنی غیر مسلموں سے علیحدہ ہو کر دین کے اشتراک کی بنا پر ایک الگ قوم کی تشکیل اور ہندوستان سے علیحدہ ہو کر مسلمانوں کی جداگانہ آزاد مملکت کا قیام اُن کی دس سالہ تگ و تاز کے نتیجہ میں۔ ہندو دل اور مسلمان نیشنلسٹوں کی مخالفت کے علی الرغم، پاکستان وجود میں آگیا۔ ہندو تو وہیں رہا لیکن (جو نیشنلسٹ پہلے ہی سے ادھر تھے ان کے علاوہ) ہندوستان کے مسلمان قومیت پرستوں، بالخصوص نیشنلسٹ علماء کا بیشتر حصہ پاکستان آگیا اور ہماری انتہائی بدقسمتی کہ انہوں نے یہاں آکر بھی اپنے سابقہ مسلک کو نہ چھوڑا۔ اس کی ایک خاص وجہ تھی۔ ان علماء کی اکثریت کا تعلق دارالعلوم دیوبند سے تھا جس کے شیخ الحدیث مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) تھے۔ یہ علماء یا تو ان کے تلامذہ (شاگرد) ہیں اور یا ان کے عقیدت مند۔ ان حضرات کے دل میں اُن کی عقیدت کس قدر ہے۔ اس کا اندازہ ایک واقعہ سے لگائیے (لاہور کے) مولانا احمد علی (مرحوم) خود طبقہ علماء و مشائخ میں ایک بلند مقام پر فائز تھے۔ ان کے متعلق ساہیوال سے شائع ہونے والے ماہنامہ "الرشید" کی جولائی ۱۹۷۶ء کی اشاعت میں اس کے مدیر (مولانا ارشد صاحب) نے لکھا کہ جب مولانا مدنی (مرحوم) کی وفات ہوئی تو مولانا احمد علی (مرحوم) نے اپنے خطبہ جمعہ میں فرمایا کہ:

> جب میں اپنی ڈاڑھی میں کنگھی کیا کرتا تھا تو جو بال اکھڑتے تھے اُن کو جمع کرتا جاتا اور خیال یہ تھا کہ جب کافی ہو جائیں گے تو پھر اس طرح کا جوتا بنواؤں گا جیسا حضرت مدنی پہنتے ہیں۔ اور جوتے میں اپنے یہ بال سلوا دوں گا اور احمد علی یہ خیال کرتا ہے کہ اگر حضرت مدنی وہ جوتا پہن لیتے تو احمد علی کی نجات کے لئے کافی تھا (۲۶)

کسی سے عقیدت ہر شخص کا ذاتی معاملہ ہے اس لئے ہم اس میں دخل نہیں دینا چاہتے۔ ہم نے یہ واقعہ محض اس امر کی وضاحت کے لئے لکھا ہے کہ جب مولانا مدنی (مرحوم) کے ساتھ مولانا احمد علی (مرحوم) جیسے جید عالم کی عقیدت کا یہ عالم تھا تو عام علمائے دیوبند کے دل میں ان کی جس قدر عظمت و عقیدت ہو سکتی ہے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ان (علماء) کے دل میں ایک لمحہ کے لئے بھی یہ خیال آسکتا ہے کہ مولانا مدنی (مرحوم) کا مسلک قومیت اسلام کے خلاف تھا؟ مسلمانوں کے دل میں علامہ اقبالؒ کا غایت احترام تھا (اور ہے) ان کے ساتھ مولانا مدنی (مرحوم) کا جو معرکہ ہوا تھا اس کی وجہ سے ان مسلمانوں کے دل میں مولانا مرحوم کی عظمت کم ہو گئی تھی۔ ان علماء پاکستان کو یہ خلش بہت ستاتی تھی۔ اس کے مداوا کے لئے انہوں نے (کچھ عرصہ سے) یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ مولانا مرحوم نے آخر میں اپنی وضاحت پیش کر دی تھی جس سے علامہ اقبال مطمئن ہو گئے تھے لہٰذا ان کے مجموعہ کلام (ارمغانِ حجاز) سے وہ قطعہ نکال دینا چاہیے

جو انہوں نے مولانا کے خلاف لکھا تھا یعنی عجم ہنوز نہ داند رموز دین ورنہ ایسا کہتے وقت وہ اس حقیقت کو فراموش کر دیتے (یا چھپا لیتے) ہیں کہ مولانا مرحوم نے علامہ اقبالؒ کی زندگی کے آخری لمحات میں تو اس کا اعتراف کر لیا تھا کہ اُن کا مسلک اقبالؒ کے مسلک کے خلاف نہیں، لیکن علامہ اقبالؒ کی وفات کے قریب چھ ماہ بعد، مولانا مرحوم نے ایک پمفلٹ بعنوان "متحدہ قومیت اور اسلام" شائع کیا تھا جس میں کہا تھا کہ اقبالؒ کا مسلک غلط تھا اور میرا مسلکِ وطنیت بالکل صحیح ہے (طلوعِ اسلام نے اسی زمانہ میں اس پمفلٹ کا جواب شائع کر دیا تھا جو اس کے فائل میں موجود ہے)۔

بہر حال ہم کہہ یہ رہے تھے کہ علماء پاکستان کی اکثریت مولانا مدنی (مرحوم) کی معتقد ہے۔ اس لئے یہ ان کے مسلک کو کبھی خلافِ اسلام نہیں خیال کر سکتی ہے۔ اس کا عملی ثبوت یہ ہے کہ قومیت کے متعلق پاکستان میں عملاً مولانا مدنی (مرحوم) کا مسلک کارفرما ہے نہ کہ علامہ اقبالؒ کا۔ کیا ان علماء میں سے کسی نے کبھی اس کے خلاف آواز اٹھائی ہے؟ جہاں تک نظامِ حکومت کا تعلق ہے اس میں بھی ان حضرات کا مسلک وہی ہے۔ جو مولانا مدنی (مرحوم) کا تھا۔ یعنی اعتقادات و عبادات اور شخصی قوانین کے سلسلہ میں ہر فرقہ کو آزادی ہونی چاہیئے اور حکومت کا دائرۂ کار ملکی قوانین تک محدود ہونا چاہیئے یعنی وہی نظام جسے نیشنلسٹ علماء نے غیر منقسم ہندوستان میں پیش کیا تھا۔ یہی آج کل وہاں رائج ہے۔ اور یہی پاکستان میں رائج ہے۔ پاکستانی علماء اس میں ذرا سی تبدیلی کے لئے بھی تیار نہیں۔

آپ نے دیکھا کہ نیشنلسٹ علماء جو کچھ وہاں چاہتے تھے اسی پر یہاں عمل ہو رہا ہے؟ جہاں تک پاکستان میں بسنے والے (سابقہ) نیشنلسٹ لیڈروں کا تعلق ہے انہوں نے یہاں سیکولرازم کو اپنا مطمعِ نگاہ قرار دے رکھا ہے۔ نیشنل عوامی پارٹی نے کہ جس کے سربراہ خان ولی خاں صاحب ہیں اپنے منشور میں اسے شامل کر رکھا ہے۔ جہاں تک قومیت کا تعلق ہے وہ اتنے حصہ تک تو اپنے سابقہ (اور ہندوؤں کے) مسلک سے متفق ہیں کہ قومیت کا مدار دین کا اشتراک نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس کے بعد ان کے موجودہ مسلک میں بنیادی تبدیلی آگئی ہے۔ ہندوستان میں ان کا مسلک یہ تھا کہ ملک کے تمام باشندے خواہ وہ نسل کے اعتبار سے کوئی ہوں ایک قوم کے افراد ہیں لیکن یہاں ان کا موقف یہ ہے کہ قومیت کا مدار وطن پر بھی نہیں بلکہ نسل پر ہے۔ یعنی پٹھان، پنجابی، سندھی اور بلوچی نسلی اختلاف کی بنا پر چار قومیں ہیں اور ان میں سے ہر قوم کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنی آزاد مملکت قائم کر لے۔ دوسری نسلیں اگر اپنے اس حق کو تسلیم کرانے کا ارادہ نہیں رکھتیں تو یہ ان کی اپنی صوابدید ہے۔ سرحد کے پٹھان بہر حال اپنے اس حق کو تسلیم کرا کر رہیں گے۔

یہ ہے وہ "علیحدگی" جس کا قصور خان ولی خان صاحب پیش کر رہے ہیں اور اس کی تائید میں قائدِ اعظمؒ کے مسلک علیحدگی کا حوالہ دے رہے ہیں۔ آپ سوچیئے کہ جہاں تک لفظ "علیحدگی"

کا تعلق ہے وہ تو ان دونوں میں مشترک ہے لیکن اس لفظ کا مفہوم ایک دوسرے سے کس قدر متضاد ہے۔ قائدِ اعظمؒ کی علیحدگی مسلمانوں کی غیر مسلموں سے علیحدگی تھی اور اس کی بنیاد کفر اور اسلام کی تفریق تھی۔ ولی خان صاحب کی علیحدگی مسلمانوں کی مسلمانوں سے علیحدگی ہے اور اس کی بنیاد نسلی تفاوت ہے۔ قائدِ اعظمؒ کی علیحدگی ہندوؤں کی حکومت سے الگ ہو کر مسلمانوں کی آزاد مملکت قائم کرنے کے لئے تھی۔ ولی خان کی علیحدگی مسلمانوں کی مملکت کے حصے بخرے کر کے نسلی بنیادوں پر چار جداگانہ مملکتوں کی تشکیل کے لئے ہے۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ قائدِ اعظمؒ کی علیحدگی اور ولی خان صاحب کی علیحدگی میں کس قدر بُعد اور تفاوت ہے۔ علاوہ ازیں ایک اور نقطہ بھی قابلِ غور ہے۔ ہندوؤں نے اشتراکِ وطن کو مدارِ قومیت قرار دیا تھا۔ یہ تصور بھی اسلام کے خلاف تھا لیکن ولی خان صاحب جو نسل کو مدارِ قومیت قرار دے رہے ہیں تو اس سے اسلام کی جڑ ہی کٹ جاتی ہے۔

حضور نبی اکرمؐ کی دعوت کی ابتداء بھی اس اعلان سے ہوئی تھی کہ قریش کے عمائد اور حبش کے غلام اسلام لانے کے بعد ایک اُمت کے افراد قرار پاتے ہیں، اور اس دعوت کا اختتام بھی (حجۃ الوداع کے خطبہ میں) ان الفاظ پہ ہوا تھا کہ آج نسلی امتیازات کے تمام باطل تصورات میرے پاؤں تلے روندے پڑے ہیں۔ حضورؐ کی زندگی میں ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ ایک جھگڑے میں ایک شخص نے اپنے قبیلہ کو مدد کے لئے آواز دی اور دوسرے نے اپنے قبیلہ کو۔ حضورؐ نے سُنا تو غصہ سے چہرا تمتما اُٹھا۔ جلدی سے ان کی طرف تشریف لائے اور ڈانٹ کر کہا کہ تم نے اسلام لانے کے بعد پھر سے کفر (جاہلیت) کی روش اختیار کر لی؟ مسلمان ہو کر قبائلی عصبیت کے کیا معنی؟ اسلام اسے مٹانے کے لئے آیا تھا۔ یہ ہے اسلام کی رُو سے قبائلی تفریق کی پوزیشن اور یہاں مسلمانوں کے اتنے اتنے بڑے لیڈر اس تفریق کو قومیت کا مدار قرار دے رہے ہیں۔ یا للعجب

کہا جاتا ہے کہ قرآن قبائل و شعوب کی تفریق کو تسلیم کرتا ہے اس لئے نسلی امتیاز کی دعوت کس طرح خلاف اسلام قرار پا سکتی ہے۔ اس کی تائید میں قرآن مجید کی حسب ذیل آیت بطور سند پیش کی جاتی ہے

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا ۚ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ (۴۹/۱۳) اے نوعِ انسان ہم نے تمہیں مرد اور عورت کے اختلاط و امتزاج سے پیدا کیا۔ اور تمہیں خاندان اور قبائل بنایا تاکہ تم ایک دوسرے سے متعارف ہو سکو۔ (لیکن یاد رکھو کہ (یہ چیز کسی تفاخر و تکریم کا موجب نہیں ہو سکتی) اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ واجب التکریم وہ ہے۔ جو سب سے زیادہ تقویٰ شعار ہے۔ بے شک خدا کا یہ ارشاد، علم و حکمت پر مبنی ہے۔

اس آیت میں، جو شعوب و قبائل کے الفاظ آئے تو اس سے بلا سوچے سمجھے نسلی امتیاز کی سند لے لی۔ اور اتنا بھی خیال نہ کیا کہ جو چیز قرآن کریم کی بنیادی تعلیم کے خلاف ہو اس کی سند خود قرآن کریم سے کس

طرح مل سکتی ہے ؟ اس قسم کا تضاد قرآن کے منجانب اللہ ہونے کے دعوے کا ابطال کرے گا۔ کیونکہ اس نے کہا ہے کہ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا (۴/۸۲) اگر قرآن خدا کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت سے اختلاف ہوتے - اس آیت کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے اس قوم کی معاشرتی زندگی کو سامنے لانا ضروری ہے جو قرآن کی اوّلین مخاطب تھی۔ عربوں کی نوّے فیصد سے بھی زیادہ آبادی صحراؤں میں رہتی تھی بایں نمط کہ دس خیموں نے اس نخلستان کے نیچے ڈیرا ڈال رکھا ہے۔ بیس کسی اور چشمے کے گرد ایستادہ ہیں۔ جب ایک مقام پر پانی یا سبزہ ختم ہوا تو انہوں نے گھر بار اونٹوں پہ لادا اور کسی اور جگہ جا بسیرا کیا۔ ان کی ساری عمر اس طرح خانہ بدوشوں کی مانند بسر ہو جاتی تھی۔ یہ نقشہ تھا ان کی قبائلی زندگی کا۔ ان حالات میں آپ سوچئے کہ مختلف آبادیوں میں باہمی تعارف کا ذریعہ کیا ہو سکتا تھا - صرف قبیلہ کی نسبت۔ اس نسبت کو محکم رکھنے کے لئے وہ قبیلہ کی گروہ بندی کو بڑی اہمیت دیتے تھے ۔ قبائل و شعوب (یعنی قبیلوں اور ان کے ذیلی خاندانوں) کی تمیز و تفریق تو اس تمدنی ضرورت (تعارف) کے لئے پیش آئی لیکن کسی دور میں ایک قبیلہ کو زیادہ قوت اور شہرت حاصل ہو گئی تو وہ دیگر قبائل کے مقابلہ میں زیادہ ممتاز اور ذی عزت سمجھا جانے لگا۔ یوں مختلف قبائل میں تفاضلی امتیازات پیدا ہو گئے۔ آگے بڑھے، تو خواہ کسی قبیلہ کے افراد میں وہ خصوصیات نہ ہی رہی ہوں جن کی بنا پر وہ باقیوں کے مقابلہ میں ممتاز اور ذی عزت قرار پایا تھا، وہ محض اس قبیلے میں پیدا ہو جانے کی وجہ سے اپنے آپ کو ممتاز اور دوسروں کو پست سمجھنے لگے ۔ رفتہ رفتہ یہ بلندی اور پستی پیدائشی تسلیم کر لی گئی۔

قرآن کریم آیا تو اس نے وحدتِ انسانیت کا پیغام عام کیا اور اس کی بنیادوں پر ایک امت کی تشکیل کی۔ اس امت میں قبائلی تفریق و تقسیم کا تصور نہیں ہو سکتا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ اگر قبائلی نسبتوں کو شباشب ختم کر دیا جائے تو ان میں تعارف کا کوئی ذریعہ باقی نہیں رہے گا۔ اس سے معاشرہ میں سخت انتشار واقعہ ہو جائے گا۔ اس انتشار کو ایک مثال کی رو سے سمجھئے۔ شہری زندگی میں گلی، کوچوں، محلوں، بازاروں، سڑکوں کے الگ الگ نام (اگرچہ فی ذاتہٖ، کوئی حیثیت نہیں رکھتے لیکن) معاشرتی زندگی میں ربط اور تعارف کے لئے یہ نہایت ضروری ہیں۔ آپ سوچئے کہ (مثلاً) اگر حکومت فیصلہ کر دے کہ کل سے لاہور میں کسی گلی، کوچے، محلے، بازار یا سڑک کا الگ نام (یا نمبر) نہیں رہے گا تو اس کی معاشرتی زندگی کی کیا کیفیت ہو جائے گی ؟ معاشرتی زندگی کی یہی وہ ضرورت تھی جس کے لئے قرآن کریم نے قبائلی تعارف کو شباشب ختم کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اس وقت کے معاشرتی مصالح کا تقاضا تھا کہ اس وجہ تعارف کو اس وقت تک باقی رہنے دیا جائے جب تک دیگر وجوہ تعارف اس کی جگہ نہ لے لیں (جس طرح آج کل ہمارے ہاں کے طبقۂ بالا میں برادری کے تعارفات ختم ہو کر نئے نئے ذرائع تعارف وجوہ میں آ رہے ہیں) اس آیت کے آخر میں خدا کی صفت "علیم و حکیم" کو نمایاں طور پر سامنے لایا گیا ہے، تو اس سے مراد یہی ہے کہ حکمتِ خداوندی کا تقاضا یہی تھا کہ اس وجہ تعارف

کی سرِدست اجازت دے دی جائے۔ اس کی تو قرآن نے اجازت دے دی لیکن قبائلی نسبت کو جو معیارِ فضیلت قرار دے دیا گیا تھا۔ اُسے یہ کہہ کر ختم کر دیا کہ [اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ] یاد رکھو۔ محض کسی خاص قبیلہ کے ساتھ نسبت، یعنی اس قبیلہ میں پیدا ہو جانا نہیں باقیوں پر افضلیت عطا نہیں کر دیتا۔ فضیلت و تکریم کا معیارِ خداوندی جوہرِ ذاتی اور تقویٰ شعاری ہے۔ یوں قرآن نے ایک ہی آیت میں قبائلی نسبت کی معاشرتی ضرورت کو وقتی طور پر باقی رکھنے کی اجازت دے دی اور اس سے تکریم و افضیلت کا جو خلافِ انسانیت تصور قائم کیا جاتا تھا، اُسے ختم کر دیا۔

معاشرتی تقاضوں کے پیشِ نظر کسی مروجہ روش کو شبا شب نہ مٹانا بلکہ اس کے اس وقت تک باقی رہنے کی اجازت دے دینا جب تک وہ بتدریج ختم نہ ہو جائے۔ اس کی مثال غلامی سے متعلق قرآنی احکام ہیں۔ نبی اکرم کے ظہورِ قدسی کے وقت عرب معاشرہ غلاموں اور لونڈیوں سے پٹا پڑا تھا۔ قرآن غلامی جیسی باعث تذلیل انسانیت لعنت کو کبھی روا نہیں رکھ سکتا تھا۔ لیکن اس نے اسے ختم کرنے کے لئے حکمت اور مصالح کو نظر انداز نہیں کیا۔ اگر وہ حکم دے دیتا کہ کل سے عرب معاشرہ میں کوئی غلام اور لونڈی باقی نہیں رہے گی تو معاشرہ میں سخت انتشار پیدا ہو جاتا۔ اس نے غلامی کے دروازوں کو تو بند کر دیا لیکن جو غلام اور لونڈیاں اس وقت عرب معاشرہ میں موجود تھے ان کے متعلق ایسے احکام دیئے جن کی رُو سے وہ رفتہ رفتہ معاشرہ کا جزو بنتے چلے گئے۔ یوں قرآن نے غلامی کو ختم کر دیا۔ لیکن بعد میں جب قرآنی نظام باقی نہ رہا اور اس کی جگہ ملوکیت اور جاگیردارانہ نظام (FEUDALISM) نے لے لی تو مسلمانوں کے حکمرانوں اور طبقہ امراء نے اپنے گھروں کو غلاموں (بالخصوص لونڈیوں) سے بھر لیا۔ اور اس کے لئے قرآن کی اُن آیات سے سند حاصل کی جن کا تعلق اُن غلاموں اور لونڈیوں سے تھا جو نزولِ قرآن کے وقت عربی معاشرہ میں موجود تھیں اور جنہیں رفتہ رفتہ جزوِ معاشرہ بنانا مقصود تھا۔

جس طرح ہم نے اپنے ہاں غلامی کا احیاء کیا اسی طرح بعد میں عہدِ جاہلیت کے نسلی امتیاز کی چنگاری کو بھی ہوا دے دی۔ خلافتِ راشدہ اُمتِ مسلمہ کی حکومت تھی۔ اب بنی اُمیہ، بنی عباس، بنو فاطمہ کی سلطنتیں قائم ہونی شروع ہو گئیں۔ اور اس کے ساتھ ہی معاشرہ میں قبائلی نسبتیں پھر سے ابھر آئیں۔ ادھر ہندوستان میں، ہم لوگ ہندوؤں سے، جو مسلمان ہوئے تو ہم نے کلمہ تو اسلام کا پڑھ لیا لیکن زندگی کے ہندوانہ نظریات معتقدات، رسوم و رواج سب ساتھ لے کر آئے۔ ورنوں (یعنی ذاتوں برادریوں) کی تقسیم ہندو معاشرہ کا بنیادی پتھر ہے جسے انہوں نے مذہبی تقدس عطا کر رکھا ہے۔ یہی تفریق ہم میں (مسلمان ہونے کے بعد بھی) ذاتوں اور برادریوں کی شکل میں قائم رہی اور یوں وہ نسلی امتیاز جسے مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا مسلمانوں کا "مسلمہ اصولِ معاشرت" قرار پا گیا۔ تحریکِ پاکستان کے دوران قوم کے سامنے ایک متفقہ نصب العین آیا تو ذاتوں، برادریوں، یا یوں کہیئے کہ نسلی امتیازات کے نقوش کچھ مدہم پڑ گئے لیکن پاکستان میں آ کر جب وہ نصب العین نگاہوں سے اوجھل ہوا تو وہ نقوش اور تیزی سے ابھر آئے۔ اب ہم سب اس لعنت میں گرفتار ہیں۔ انتخابات کے زمانے میں برادریوں کی تقسیم نمایاں طور پر سامنے آ جاتی ہے اور،

حکومتیں قائم کرنے کے وقت پٹھان، پنجابی، سندھی، بلوچی (چار قوموں) کا نعرہ بلند ہونے لگتا ہے اور تماشہ یہ ہے کہ ایسا کرنے اور کہنے والے سب اسلام کے قائل ہیں! یہ ہے سیاسی سطح پر وہ علیحدگی جس کے سب سے بڑے داعی ولی خان صاحب ہیں۔

سوچیئے کہ ایک علیحدگی اُن مسلمانوں کی تھی کہ جب حضرت سلمانؓ فارسی سے پوچھا گیا کہ نام۔ تو فرمایا مسلمان اور جب پوچھا گیا کہ باپ کا نام تو کہا اسلام۔ یعنی اس میں بیٹا اپنی نسبت غیر مسلم باپ کی طرف کرنا بھی پسند نہیں کرتا تھا۔ اور یہ قرآن مجید کے اس حکم کی رُوح کے عین مطابق تھا جس میں کہا گیا ہے کہ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْۤا اٰبَآءَكُمْ وَ اِخْوَانَكُمْ اَوْلِیَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِیْمَانِ - اے جماعت مومنین اگر تمہارے ماں باپ یا (بہن) بھائی بھی اسلام کے مقابلہ میں کفر کو پسند کریں تو اُن سے بھی دوستداری کے تعلقات نہ رکھو۔ وَ مَنْ یَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (۹/۲۳) جو ان سے دوستداری کے تعلقات رکھے گا، تو اس کا شمار ظالمین میں سے ہوگا۔ دوسری جگہ ہے وَ مَنْ یَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ (۵/۵۱) اُن میں سے جو بھی (اِن غیر مسلموں سے) دوستداری کے تعلقات رکھے گا اس کا شمار بھی انہی میں سے ہوگا۔ یہ ان مسلمانوں کی علیحدگی تھی۔ کفر سے کٹ کر اسلام کی طرف آنے کی "حزب الشیطان" سے الگ ہو کر حزبُ اللہ میں شامل ہونے کی۔ اور ایک ہم ہیں کہ خود مسلمانوں سے الگ ہو کر نسلی امتیاز پر جداگانہ قوم بننے کا نعرہ بلند کرتے ہیں۔ جیسا کہ پہلے بھی کہا گیا ہے اب کہنے والے وہ لوگ ہیں جو غیر منقسم ہندوستان میں ہندوؤں کے ساتھ مل کر ایک (متحدہ) قوم بننے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ اُس وقت یہ لوگ صوبہ سرحد میں بسنے یا پٹھان نسل سے متعلق ہونے کی بنا پر جداگانہ قومیت کے مدعی نہیں تھے۔ آج یہ انہی بنیادوں پر مسلمانوں سے الگ ہو کر جداگانہ قومیت کا نعرہ بلند کرتے ہیں۔ یا للعجب۔

خان ولی خان صاحب کے متعلق ہم اتنا حسن ظن اب بھی رکھتے ہیں کہ انہیں اپنے مسلمان ہونے پر فخر ہوگا۔ اگر یہ درست ہے تو کیا ہم ان سے بصد ادب اتنا پوچھنے کی جرأت کر سکتے ہیں کہ صوبہ سرحد کے باشندہ یا بہ خاص نسل سے متعلق ہونے کی بنا پر باقی مسلمانوں سے الگ قومیت کا دعوےٰ کون سے اسلام کی رُو سے جائز قرار پا سکتا ہے؟ یہی سوال ہمارا ان (دیگر) حضرات سے بھی ہے جو صوبائی یا نسلی تفریق کی بنا پر جداگانہ قومیتوں کا نعرہ بلند کرتے ہیں۔ ان حضرات سے ہماری گذارش یہ ہے کہ اگر مسلمان ہونے کا دعویٰ ہے تو اسلام کو کہیں تو حق و باطل کا معیار اور صحیح اور غلط کا مدار قرار دیجئے؟

اور یہی سوال ہمارا ان حضرات سے بھی ہے، جو زبان سے دو قومی نظریہ کا دعوےٰ کرتے رہتے ہیں لیکن عملاً حدود پاکستان میں بسنے والے مسلموں اور غیر مسلموں کو ایک قوم قرار دیتے ہیں یعنی ان کے نزدیک بھی اسلام بنائے قومیت نہیں۔ وطن کا اشتراک معیار قومیت ہے (وہی مرغی وہی منتری)

★ ———— ★

جنگِ ترکی و یونان - آغاز

پہلی جنگ عظیم کے بعد، ترکی کی حالت اس قدر سقیم ہوگئی تھی کہ دولِ مغرب اسے یورپ کا مردِ بیمار کہہ کر پکارنے لگیں اور اس کے حصے بخرے کرنے کی فکر میں تھیں۔ یہی حالت کچھ کم اندوہناک نہیں تھی کہ یونان نے ترکی پر حملہ کردیا اور وہاں قیامت برپا کردی۔ ہندی مسلمانوں کو تمام مسلمان ممالک سے بالعموم اور ترکی سے بالخصوص، جو قلبی تعلقات شروع سے چلے آتے ہیں، ان کی بناء پر اس حادثہ پر ان کے گھروں میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ گلی کوچوں میں کہرام مچ گیا۔ دیدۂ بینائے قوم، علامہ اقبالؒ کا معمول تھا کہ وہ انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس میں ایک تازہ نظم سنایا کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس سال کے اجلاس میں اس سانحہ ہوش رُبا سے زیادہ مؤثر اور دلگداز موضوع اور کونسا ہوسکتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اس اجتماع میں اپنی وہ نظم سنائی جس کا عنوان ہے۔ خضرِ راہ۔ نظم کیا سنائی، جلسہ گاہ کو ماتم کدہ بنا دیا۔ خود بھی جی بھر کر روئے اور سامعین کو بھی خون کے آنسو رُلایا۔ اس کے بعد نظم کے یہ اشعار ملک میں بچے بچے کی زبان پر تھے :-

لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیلؑ
خشتِ بُنیادِ کلیسا بن گئی خاکِ حجاز!
ہوگئی رسوا زمانے میں کلاہِ لالہ رنگ
جو سراپا ناز تھے ہیں آج مجبورِ نیاز!
حکمتِ مغرب سے ملّت کی یہ کیفیت ہوئی
ٹکڑے ٹکڑے جس طرح سونے کو کر دیتا ہے گاز
ہوگیا مانندِ آب ارزاں مُسلماں کا لہو
مضطرب ہے تو کہ تیرا دل نہیں دانائے راز

جنگ ترکی اور یونان۔ انجام

اِس بیکسی اور بے بسی کے عالم میں، مصطفےٰ کمال اٹھا اور اپنے مٹھی بھر رفقاء کے ساتھ، یونانیوں پر اس طرح سے جھپٹا کہ اُن کے بال و پر نکل نوچ لیئے۔ ترکی کو حیاتِ نو عطا ہو گئی۔ اس کا شمار پھر سے زندہ قوموں میں ہونے لگا کہ اتنے میں انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس کی تقریب منعقد ہوئی۔ اس میں علامہ اقبال نے جس کیف و مسرت کے عالم میں اپنی مشہور نظم۔ طلوعِ اسلام پیش کی اس منظر کے دیکھنے والوں کے ذہن سے اس کے تاثرات ابھی تک کم نہیں ہوئے۔ انہوں نے جھوم جھوم کر اس نشید جانفزا سے محفل کو نشاط آگیں بنا دیا کہ:

دلیلِ صبحِ روشن ہے ستاروں کی تنک تابی ۔ اُفق سے آفتاب اُبھرا گیا دورِ گراں خوابی!
عروقِ مُردۂ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا ۔ سمجھ سکتے نہیں اِس راز کو سینا و فارابی!
مُسلماں کو مُسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے ۔ تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی
اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے ۔ کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا!
عقابی شان سے جھپٹے تھے جو بے بال و پر نکلے ۔ ستارے شام کے خونِ شفق میں ڈوب کر نکلے!
جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں ۔ اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے!
بیا ساقی نوائے مُرغ زار از شاخسار آمد ۔ بہار آمد نگار آمد نگار آمد قرار آمد!
"بیا تا گل بیفشانیم و مے در ساغر اندازیم ۔ فلک را سقف بشگافیم و طرحِ دیگر اندازیم"

ہمیں اُمید ہے کہ ترکی اور یونان کی موجودہ آویزش کا بھی ایسا ہی انجام ہوگا۔ خدا ایسا ہی کرے۔

باسمہٖ تعالیٰ

یوم آزادی کی تقریب پر

پروفیسر صاحب کا

خطاب

پاکستان کا ازلی دشمن

جسے

۱۱ر اگست ۱۹۷۴ء کو

وائی. ایم. سی. اے ہال (لاہور) میں پیش کیا گیا!

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پاکستان کا ازلی دشمن

پرویز

عزیزانِ من! السّلام علیکم ورحمۃ اللہ

جس طرح یہ بات ہماری نئی نسل کی سمجھ میں نہیں آتی کہ ہم نے پاکستان کا مطالبہ کیوں کیا تھا، اسی طرح وہ یہ بھی نہیں سمجھ سکتی کہ ہندو ہمارا اس قدر دشمن کیوں ہے؟ پھر، جس طرح مطالبہ پاکستان کے متعلق اسے بالعموم یہ بتایا جاتا ہے کہ اس کے اسباب سیاسی یا بیشتر معاشی تھے۔ اسی طرح ہندو دشمنی کے متعلق بھی اتنا ہی کہا جاتا ہے کہ وہ نہیں چاہتا کہ اس کے ملک کا کوئی حصہ اس سے کٹ کر الگ ہو جائے۔ اگر بعض ناگزیر حالات کے تحت یہ حصہ ان کے ملک (بھارت) سے الگ ہو گیا ہے تو اس کی انتہائی خواہش ہے کہ یہ پھر کسی نہ کسی طرح اس سے دوبارہ ملحق ہو جائے۔ یہ جزو اپنی اصل سے جا ملے۔ اور جب ہم اپنی نئی نسل کو علیحدگی کے یہ اسباب بتاتے، اور ان دونوں ملکوں کو پھر سے متحد کرنے کے لئے ہندوؤں کے ان جذبات کا تذکرہ کرتے ہیں تو بحث یہ چھڑ جاتی ہے کہ ہمیں اس علیحدگی کی ضرورت کیا تھی؛ اور اگر یہ غلطی ہو گئی تھی تو اب اس کا ازالہ کیوں نہیں کر لیا جاتا۔ غلطی پر اڑے رہنا حماقت ہے۔ ہماری نئی نسل بحث میں اس نتیجہ پر پہنچنے میں حق بجانب ہے۔ کیونکہ ہم نے انہیں بتایا ہی نہیں کہ مطالبہ پاکستان کا صحیح جذبۂ محرکہ کیا تھا، ہندو نے اس کی مخالفت کیوں کی تھی۔ اب وہ دوبارہ اسے یکجا کیوں کرنا چاہتا ہے اور ہم اس کی مخالفت کیوں کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یومِ آزادی (۱۴ر اگست) کی تقریب پر بحالاتِ موجودہ اس سے موزوں تر موضوع کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ میں نے اس لئے اپنے آج کے خطاب کے لئے اس موضوع کو ترجیح دی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ میں گزشتہ پچیس چھبیس سال (بلکہ یوں کہیئے کہ ۱۹۳۸ء سے، جب طلوعِ اسلام وجود میں آیا تھا، ان حقائق کو پیش کرتا چلا آ رہا ہوں۔ لیکن ان کا ایک بار پھر مربوط شکل میں سامنے لانا ازبس ضروری ہے۔

(۱)

اللہ تعالیٰ نے انسان کو صاحبِ اختیار و ارادہ پیدا کیا تو ساتھ ہی (بذریعہ وحی) کچھ حدود متعین کر دیں۔ اور کہہ دیا کہ اگر وہ اپنے اختیار کو ان حدود کے اندر رہتے ہوئے استعمال کرے گا تو معاشرہ کا توازن برقرار رہے گا۔ اور کاروانِ انسانیت شاداں و فرحاں، اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ جائے گا۔ ان حدود کو اقدارِ خداوندی یا ابدی ضابطۂ حیات کہا جاتا ہے (اور اب یہ قرآنِ مجید کے اندر محفوظ ہیں)۔ تفصیل ان اقدار و ضوابط کی طویل ہے لیکن

منتہیٰ ان کا تکریمِ انسانیت کا تحفظ اور احترامِ آدمیت کا استحکام ہے۔ بالفاظِ دیگر، ان اقدار و ضوابط سے مقصود یہ ہے کہ دنیا میں نہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محکوم ہو، نہ محتاج۔ ظاہر ہے کہ یہ اقدار و ضوابط، مفاد پرست گروہوں پر سخت گراں گذریں گے۔ اصولی طور پر ان گروہوں کو تین شقوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے ملوکیت، یعنی دوسرے انسانوں سے اپنے احکام کی اطاعت کرانا۔ مذہبی پیشوائیت، یعنی خدا کے نام پر عوام کو اپنی ہوسِ اقتدار کی تسکین کا ذریعہ قرار دینا۔ اور سرمایہ پرستی، یعنی ذرائع رزق کو اپنے قبضہ میں رکھ کر کمزوروں اور ناتوانوں کو اپنے شکنجۂ استبداد میں جکڑے رکھنا۔ ان گروہوں کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ معاشرہ اقدارِ خداوندی کے مطابق قائم نہ ہونے پائے۔ اسی کو کشمکشِ حق و باطل یا آویزشِ ابلیس و آدم کہا جاتا ہے۔ یہ کشمکش ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گی۔ بقول اقبالؒ

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز	چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

کشمکشِ حق و باطل

اس کشمکش کی صورت کچھ یوں رہتی ہے کہ جب تک یہ اقدار و اصول، حروف و الفاظ (یعنی محض معتقدات و نظریات) کی حد تک رہیں، مفاد پرست قوتیں ان سے کچھ زیادہ تعرض نہیں کرتیں۔ کیونکہ وہ جانتی ہیں کہ اس سے ان کا کچھ نہیں بگڑتا، اگرچہ وہ ان پر کڑی نگاہ رکھتی ہیں کہ ان کی تبلیغ و اشاعت سے یہ عملی پیکر نہ اختیار کرنے پائیں۔ یہ جو سیکولر حکومتیں مذہبی آزادی دیتی ہیں تو اس سے یہی مفہوم ہوتا ہے۔ لیکن جب اور جہاں یہ نظریات عملی صورت اختیار کرنے لگیں، یہ انہیں کچلنے کی انتہائی کوشش کرتی ہیں اور میدانِ جنگ تک میں اتر آتی ہیں۔ حضرات انبیاء کرام کا مشن یہ تھا کہ وہ ان اقدار و اصول کی تبلیغ اور اشاعت سے ایک جماعت متشکل کریں، جو انہیں عملاً نافذ کرنے کے لئے ہر قربانی کے لئے تیار ہو جائے تاکہ نوعِ انسان ان استبدادی قوتوں کی گرفت سے خلاصی حاصل کرے۔ مفاد پرست گروہوں نے ان جماعتوں کی مخالفت کس کس انداز سے کی، قرآن کریم نے اسے شرح و بسط سے بیان کیا ہے۔ اقوامِ سابقہ سے آگے بڑھ کر جب ہم اس دور میں آجاتے ہیں جب ان اصول و اقدار کو آخری اور مکمل شکل میں عطا کیا گیا اور خدا کے آخری رسول، حضور نبی اکرمؐ کے زیرِ لوا قدسیوں کی اس جماعتؓ نے جس پر خدا اور ملائکہ تحسین و تبریک کے پھول نچھاور کرتے تھے، انہیں عملاً نافذ کرنے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دی تو مفاد پرست گروہوں نے بڑی شدت سے اس کی مخالفت کی۔ تاریخ کے اوراق اس کی زندہ شہادت ہیں۔ حضورؐ کی مکی زندگی، ان اقدار و اصولات کی نشر و اشاعت اور ان کی بنیادوں پر تشکیلِ جماعت کا ابتدائی دور تھی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس دور میں اگرچہ انفرادی طور پر اذیت رسانیوں اور صعوبات انگیزیوں کے واقعات رونما ہوتے رہے، لیکن مفاد پرست گروہ نے منظم طور پر ان کی مخالفت میں کوئی قدم نہ اٹھایا۔ لیکن جونہی اس پروگرام کا دوسرا دور شروع ہوا جسے مدنی زندگی کہہ کر پکارا جاتا ہے اور جس میں ایسی مملکت کی بنیاد رکھی گئی جس میں ان اقدار نے قانون کی حیثیت سے مدون ہونا تھا، ان قوتوں نے منظم مخالفت شروع کر دی اور مسلسل سات آٹھ برس تک اپنی یورشوں کا سلسلہ جاری رکھا تا آنکہ وہ ہار تھک کر سپر انداز ہو گئیں۔

(۰)

اُس دورِ ہمایوں کے بعد وہ مملکت نہ رہی جس میں ان اقدار و ضوابط کو قوانین حکومت کی شکل میں نفاذ پذیر ہونا تھا۔ اب ان کی حیثیت محض نظری یا رسمی رہ گئی۔ اس تبدیلی کو ان الفاظ میں بھی بیان کیا جائے گا کہ دین مذہب میں تبدیل ہو گیا۔ اب مفاد پرست گروہوں کو ان سے چنداں خطرہ نہ رہا۔ اس لئے انہوں نے منظم طور پر ان سے تعرض نہ کیا۔ (جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے) سیکولر حکومتوں میں جس مذہبی آزادی کا ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوتی کہ ان اصول و اقدار کی وعظ و نصیحت کی صورت میں تبلیغ کی جائے اور بعض کی رسمی طور پر ادائیگی کر لی جائے۔

تحریک پاکستان

اس صدی کے شروع میں، علامہ اقبالؒ نے مسلمانانِ ہند کو اس فراموش کردہ حقیقت کی یاد دلائی کہ جسے تم اسلام کا اتباع سمجھے ہو، یہ مذہب کی پابندی ہے، دین کی نہیں۔ اور جسے مذہبی آزادی کہا جاتا ہے وہ دین کے اصولات و اقدار کی نظری تبلیغ کی اجازت اور رسومات کی ادائیگی سے عدم تعرض ہے۔ یہ دین کی آزادی نہیں ہے۔ انہوں نے اس بسیط حقیقت کو ان جامع الفاظ میں سمو کر رکھ دیا تھا کہ:

ملا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت ۔۔۔ ناداں سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

وہ دین اور مذہب کے اس فرق کو مسلسل بیان کرتے چلے گئے۔ مسلمانوں میں سے بہت کم لوگوں نے اس فرق کو سمجھا لیکن ہندوؤں کے اکثر و بیشتر دانشوروں نے اس حقیقت کو بھانپ لیا کہ اقبال کے اس پیغام کا منتہیٰ کیا ہوگا۔ چونکہ وہ زمانہ انگریز کی حکومت کا تھا۔ اس لئے ہندوؤں کی طرف سے اسلام کے اس فلسفۂ زندگی کی جارحانہ مخالفت ممکن نہ تھی۔ بنا بریں انہوں نے اس آنے والے خطرہ کی روک تھام کے لئے، یعنی اس خطرہ کی روک تھام کے لئے کہ ہندوستان میں اسلام، کہیں مذہب سے دین کی شکل اختیار نہ کر جائے، تنظیمی تدابیر اختیار کرنا شروع کر دیں۔ سنگھٹن (یعنی ہندوؤں کا منظم اتحاد) اور شدھی (مسلمانوں کو تبدیلیٔ مذہب سے ہندو بنانے) کی تحریکیں انہی تدابیر کی عملی تعبیریں تھیں۔ اُس زمانے میں لالہ ہردیال، ہندوؤں کا ایک مشہور جوشیلا لیڈر تھا۔ اس نے ان تحریکوں کو عام کرنے کے لئے منظم پراپیگنڈہ شروع کر دیا۔ وہ اپنے ایک مضمون میں جو ۱۹۲۴ء میں اخبار تیج کے کرسمس نمبر میں شائع ہوا تھا، لکھتا ہے:

سنگھٹن اور شدھی

ہندو سنگھٹن کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان میں ایک متحد اور گروہیں سے باخبر، فعال سیاسی جماعت کی تشکیل کی جائے جو ایک، آزاد اور خود مختار ریاست کے قیام کے لئے جدوجہد کر سکے۔ ہندوستان کے سیاسی مسئلہ کو حل کرنے کا صرف یہی ایک طریقہ ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کو شدھی کے ذریعے (پاک کر کے) ہندو دھرم میں شامل کر لیا جائے۔

لالہ ہردیال نے اپنے ایک اور مضمون میں جو روزنامہ تیج "دہلی" کی ۲۱ مارچ ۱۹۲۵ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا، لکھا:

ہندو سنگھٹن کے لئے ہندو سوراجیہ (حکومت) کا آدرش (نصب العین) ضروری ہے۔ پنجاب

میں ہندو سوراجیہ قائم کرنے کے آندولن ہی سے لوگوں میں قربانی کی طاقت پیدا کی جا سکتی ہے۔ ہندو سنگھٹن کا یہ اصول ہونا چاہیئے کہ جب تک ہندوستان بالخصوص پنجاب، بدیشی مذہبوں سے پاک نہیں ہوں گے ہمیں کبھی چین سے سونا نہیں ملے گا۔ جو ہندو اس آدرش کو نہیں مانتا وہ کپوت ہے، بے جان ہے، مُردہ دل ہے، بے سمجھ ہے۔" اس نے ہندوؤں کو مزید مشتعل کرنے کے لئے لکھا۔ "پنجاب اور ہندوستان میں دو قومیں نہیں رہ سکتیں۔ یا سب ہندو اسلام قبول کر لیں یا سب مسلمانوں کو شدھی کے ذریعے ہندو بنا لو۔ یہی اس سوال کا حل ہے۔ مذہب اسلام ایک ایسی انوکھی چیز ہے کہ مسلمان کسی ملک میں دوسری قوموں کے ساتھ شریک نہیں ہو سکتے، اتفاق اور امن کے لئے ضروری ہے کہ یا صرف اسلام ہو یا اسلام بالکل نہ ہو۔ بیس فیصد اسلام سے صرف بلوہ فساد ہوں گے بیس فیصد اسلام کے روڑے کو کوئی ملک ہضم نہیں کر سکتا۔ جس ملک نے اس پتھر کو نگل لیا اس کے پیٹ میں ہمیشہ درد رہے گا۔ پس اسلام کی تاریخ اور مزاج کو جان کر ہمیں ہندو اتحاد کی کوشش شروع کر دینی چاہیئے۔ اب تو صرف ذاتی طور پر ہندھی کرنی چاہیئے، سوراج ملنے پر ریاست کی مدد سے شدھی کی تحریک کو ترقی دینی چاہیئے۔"

لالہ ہردیال اپنی اس تحریک کو ہندوستان تک ہی محدود نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ وہ افغانستان کو بھی ہندو دائرے کے اندر سمیٹ لینا چاہتے تھے۔ چنانچہ انہی دنوں انہوں نے اپنے ایک اور مضمون میں لکھا۔

افغانستان کوئی جدا ملک نہیں، یہ ہندوستان، پنجاب کا ایک حصہ ہے۔ افغانستان میں ہماری مورتیاں، بُت، اور مندروں کے کھنڈرات آج تک پائے جاتے ہیں۔ جب تک افغان اور سرحدی قبائل کے مسلمان بھی ہندو قوم میں شامل نہیں کئے جائیں گے، اس وقت تک ہمارے ملک کی حفاظت کا پورا پورا انتظام نہیں ہو سکتا۔ تاریخ ہند سے ظاہر ہے کہ ان پہاڑی علاقوں سے ہم کو بہت دُکھ پہنچ سکتا ہے۔ مگر اس دُکھ کا اندیشہ صرف اس وقت تک ہے جب تک یہ بہادر لوگ اسلام کے ہیرو اور مسلمان ہیں۔ مگر جب ہم ان کو ہندو بنا لیں گے تو یہ خطرہ جاتا رہے گا۔ لہٰذا افغان اور سرحدی مسلمانوں کو ہندو بنا دینا ہمارا بہت ضروری فرض ہے۔ تمام ہندو قوم کو یاد رکھنا چاہیئے کہ ہر ہندو کے سامنے یہ تین اصول ہر وقت رہنے ضروری ہیں۔ ایک تو ہندو سوراج۔ دوسرے ہندوستان کے سب مسلمانوں اور عیسائیوں کو ہندو بنانا، تیسرے افغانستان اور سرحد کو ختم کرنا اور وہاں کے باشندوں کو ہندو بنانا۔

اس کے بعد وہ افغانستان سے بھی آگے بڑھے اور کہا کہ:۔

جب ہندو قوم میں پورا پورا جوش پیدا ہو جائے گا تو سوراج، شُدھی اور افغانستان کی فتح کے علاوہ ممکن ہے کہ ہم مشرقی افریقہ، فجی، اور دوسرے ملکوں پر بھی قابض ہو جائیں جہاں ہندو بھائی آباد ہیں کیونکہ اس وقت ہم کسی ہندو بھائی کو غلامی کی حالت میں نہیں چھوڑیں گے۔ پس ہندوستان کو اگر کبھی آزادی ملے گی تو یہاں ہندو راج قائم ہوگا۔ بلکہ مسلمانوں کی شدھی،

افغانستان کی فتح، وغیرہ باقی آورش بھی پورے ہو جائیں گے۔ (اخبار ملاپ۔ ۱۳ جون ۱۹۱۵ء)

اُسی زمانے میں ہندوؤں کے ایک اور مشہور لیڈر، سوامی سیتا دیو نے اپنی ایک تقریر میں واضح الفاظ میں کہا تھا کہ:-

جب ہم طاقتور ہو جائیں گے تو ہم مسلمانوں کے سامنے یہ شرائط رکھیں گے۔

(۱) قرآن کو الہامی کتاب مت مانو۔
(۲) محمدؐ کو خدا کا نبی مت مانو۔
(۳) مکہ کے ساتھ اپنا کوئی تعلق نہ رکھو۔
(۴) سعدی اور رومی کی بجائے کبیر اور تلسی داس کو پڑھو۔
(۵) اسلامی تقریبات کی بجائے ہندوؤں کی تقریبات مناؤ۔
(۶) وہ تمام تقریبات مناؤ جن کا تعلق رام کرشن اور دوسرے دیوتاؤں سے ہے۔

(اخبار الوکیل۔ امرتسر۔ ۹ دسمبر ۱۹۲۵ء)

اور پروفیسر رام دیو نے تو واضح تر الفاظ میں کہہ دیا کہ:-

ہندوستان کی ہر ایک مسجد پر ویدک دھرم یا آریہ سماج کا جھنڈا بلند کیا جائے گا۔

(اخبار گرو گھنٹال۔ ۱۰ جنوری ۱۹۲۷ء)

آپ نے دیکھا کہ ہندوؤں کے عزائم کیا تھے؟ اس سے واضح ہے کہ سوراجیہ (یعنی آزادیٔ ہند) کی تحریک سیاسی نہیں تھی بلکہ یکسر مذہبی تحریک تھی۔ بہرحال، ہندو لیڈر موقع بے موقع اپنے اِن عزائم کا اظہار کرتے رہے اور دوسری طرف علامہ اقبالؒ ان بیانات سے کوئی اثر لئے اور مشتعل ہوئے بغیر اپنا پیغام عام کرتے رہے کہ اسلام ایک زندہ حقیقت اُسی صورت میں بن سکتا ہے جب مسلمانوں کی اپنی آزاد حکومت ہوگی۔ انہیں مشتعل ہونے کی ضرورت اس لئے نہیں تھی کہ اُن کے اس پیغام کا جذبۂ محرکہ، ہندوؤں کے خلاف انتقامانہ نہیں تھا۔ یہ قرآن کریم کا تقاضا اور دین کی اصل و بنیاد تھی۔ اس لئے وہ اسے دینی حقیقت کے طور پر پیش کرتے تھے نہ کہ کسی ردِّ عمل کے طور پر۔ وہ اس پیغام کو عام کرتے چلے گئے۔ تا آنکہ انہوں نے ۱۹۳۰ء میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ الٰہ آباد میں اپنے خطبۂ صدارت میں اسے ایک متعین شکل میں قوم کے سامنے رکھ دیا۔ انہوں نے فرمایا:-

اقبالؒ کا خطبۂ صدارت

ہندوستان دنیا بھر میں سب سے بڑا اسلامی ملک ہے۔ اس ملک میں اسلام بہ حیثیت ایک تمدنی قوت کے اسی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے کہ اُسے ایک علاقہ میں مرکوز کر دیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام خدا اور بندے کے درمیان ایک روحانی تعلق کا نام نہیں۔ یہ ایک نظامِ حکومت ہے۔ اس نظام کا تعین اس وقت ہو چکا تھا جب کسی رسول کے دل میں ایسے نظام کا خیال تک بھی نہیں آیا تھا..... اس کی صحیح قدر و قیمت اس وقت معلوم ہوتی ہے جب وہ ایک معاشرتی نظام کی مشینری میں اپنی جگہ فٹ ہو (اور یہ مقصد اپنی آزاد مملکت کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا) اس لئے میری آرزو یہ ہے کہ پنجاب

صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک واحد اسلامی ریاست قائم کر دی جائے۔۔۔۔۔ اس سے اسلام اپنی تعلیم اور ثقافت کو پھر سے زندگی اور حرکت عطا کر سکے گا اور انہیں عصر حاضر کی روح کے قریب تر لانے کے قابل بنا سکے گا۔

مسلمانوں نے تو اس وقت اس اسکیم کو محض ایک شاعر کا خواب سمجھا لیکن ہندو بھانپ گیا کہ ہوا کا رخ کس سمت کو ہے چنانچہ اس نے انتہائی غور و فکر کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ اسے اپنی پہلی اسکیم۔ یعنی مسلمانوں کو شدھ کر کے ہندو بنا لینے کی اسکیم ترک کر دینی چاہیئے اور اس کے بجائے ایسا دام ہمرنگ زمیں بچھانا چاہیئے جس سے سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ ایک طرف اس نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ اب وہ زمانہ ختم ہو گیا ہے جب مذہب کی بنیادوں پر مملکتوں کا قیام عمل میں لایا جاتا تھا اور دوسری طرف اس پراپیگنڈہ کو عام کیا کہ آزادی ملنے کے بعد ہندوستان میں ہندو راج قائم نہیں کیا جائے گا۔ جمہوری انداز کی حکومت ہو گی جس میں پوری کی پوری ہندوستانی قوم (یعنی ہندو مسلمان وغیرہ) ایک قوم کی حیثیت سے شریک ہوں گے۔ اور نظام حکومت سیکولر ہو گا۔ آپ نے غور کیا کہ یہ صرف الفاظ کا فرق تھا۔ نصب العین پیش نظر وہی پہلے کا تھا۔ جمہوری انداز حکومت میں، حکومت اکثریت کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور ہندوستان میں ہندو، اتنی عظیم اکثریت میں تھے کہ وہ کبھی اقلیت میں تبدیل ہو ہی نہیں سکتے تھے، نہ ہی مسلمان اکثریت میں آ سکتے تھے۔ لہٰذا عملاً حکومت ہندوؤں ہی کی رہتی تھی۔ جہاں تک سیکولر نظام کا تعلق ہے، اس سے مقصود یہ تھا کہ مسلمانوں کو نماز، روزہ یا شخصی قوانین کی حد تک مذہبی آزادی ہو اور تمدنی قوانین اکثریت (یعنی ہندوؤں) کے وضع کردہ ہوں۔

سیکولرازم کی تحریک

جہاں تک اسلام کی بنیادوں پر ایک جداگانہ مملکت کے قیام کا سوال تھا، ہندوؤں نے اسکی مخالفت میں اپنی پراپیگنڈہ کی مہم کو تیز تر کر دیا۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے کہا کہ:۔

> جس چیز کو مذہب یا منظم مذہب کہا جاتا ہے اسے ہندوستان اور دوسری جگہ دیکھ دیکھ کر میرا دل ہیبت زدہ ہو گیا ہے۔ میں نے اکثر مذہب کی مذمت اور اسے یکسر مٹا دینے کی آرزو کی ہے۔ (میری کہانی۔ صفحہ ۱۶۱)

ظاہر ہے کہ "منظم مذہب" سے پنڈت جی کا اشارہ اسلام ہی کی طرف تھا۔ کانگریس کے دوسرے مشہور لیڈر مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی نے ایوان اسمبلی میں جس میں وہ کانگریس پارٹی کے لیڈر تھے، پکار کر کہا کہ:۔

> اب یہ ناممکن ہے کہ کوئی ایسا نظام حکومت قائم کیا جا سکے جس کی بنیاد مذہب پر ہو۔ اب وقت آ چکا ہے کہ ہم اعتراف کر لیں اور اسے اچھی طرح ذہن نشین کر لیں کہ ضمیر، مذہب اور خدا کو ان کے مناسب مقام یعنی آسمان کی بلندیوں پر رکھ دیا جائے اور انہیں خواہ مخواہ زمین کے معاملات میں گھسیٹ کر نہ لایا جائے۔ اس بات کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ اگر مذہب کو سیاست سے الگ نہ کیا جائے تو کوئی نظام حکومت قائم رہ سکتا ہے۔ عصر حاضر میں بہترین نظام حکومت اس نظریہ پر قائم ہو سکتا ہے کہ جغرافیائی حدود کے اندر گھرا ہوا ایک ملک ہو اور اس

ملک کے اندر رہنے والے تمام افراد معاشی اور سیاسی مفاد کے رشتے میں منسلک ہو کر ایک قوم بن جائیں۔ (ہندوستان ٹائمز۔ ۱۹۳۸-۹-۵)

اس پر حاشیہ آرائی کرتے ہوئے ہندوستان ٹائمز نے لکھا کہ :-

حکومتِ الٰہیہ کا تصور ایک داستانِ پارینہ ہے اور مسلمانوں کا فعل عبث ہوگا اگر وہ ہندوستان جیسے ملک میں اس کے احیاء کی کوشش کریں۔ جہاں مختلف جماعتیں ایک دوسرے سے گتھی ہوئی ہیں یا اس امر کا خیال کریں کہ اس مقصد کے لئے ملک کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ یہ علامت خوش آیند ہے کہ خود مسلمانوں کے ذمہ دار رہنما اس سراب کے پیچھے لگنا نہیں چاہتے۔

(ہندوستان ٹائمز۔ ۳۹-۱۱-۱۴)

اور خود مسٹر گاندھی نے کہا :-

اگر میں ڈکٹیٹر ہوتا تو مذہب اور حکومت کو بالکل الگ الگ کر دیتا۔ مجھے میرے مذہب کی قسم، میں اس کے لئے جان تک دے دیتا۔ مذہب میرا ذاتی معاملہ ہے۔ حکومت کو اس سے کیا واسطہ۔ حکومت کا منصب یہ ہے کہ وہ تمہاری دنیاوی ضروریات کا خیال رکھے ..... مذہب سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔ مذہب ہر شخص کا پرائیویٹ معاملہ ہے۔

(ہریجن۔ ۱۹۴۶-۱۲-۹)

انہوں نے دوسرے مقام پر کہا :-

اگر مذہب کو علیٰحدہ رہنے دیا جائے۔ یعنی ایک بحث کا معاملہ۔ اور خدا اور بندے کے درمیان ایک ذاتی تعلق۔ تو پھر ہندوؤں اور مسلمانوں کے کئی ایک اہم مشترک عناصر نکل آئیں گے جو مجبور کریں گے کہ یہ دونوں ایک مشترکہ زندگی بسر کریں۔ اور ان کی راہِ عمل بھی مشترک ہو۔

(ہندوستان ٹائمز)

۹۶/۴۰

میں نے برادرانِ عزیز! بات یہاں سے شروع کی تھی کہ ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان متنازعہ فیہ مسائل، سیاسی یا معاشی نہیں تھے۔ اس اختلاف کی بنیاد مذہب پر تھی۔ مسلمانوں کا مقصد یہ تھا کہ اسلام جو صدیوں سے مذہب کی شکل میں مروج چلا آ رہا تھا اور اس کا مقصد صرف اتنا رہ گیا تھا کہ چند نظریات اور "عبادات" کی چند شکلوں پر رسمی طور پر عمل کر لیا جائے یا نکاح طلاق وغیرہ معاملات کو فقہ کی رو سے انفرادی طور پر طے کر لیا جائے، اسے اس دین کی صورت میں رائج کیا جائے جو عہدِ رسالتمآبؐ اور خلافتِ راشدہ میں نافذ العمل تھا اور جس سے مقصود یہ تھا کہ زندگی کے ہر معاملہ کو خدا کی عطا کردہ راہنمائی کے مطابق طے کیا جائے اور اقتدارِ خداوندی

کو اس طرح عملی شکل دی جائے کہ اس سے تمام افراد انسانیہ کی مضمر صلاحیتیں نشو و نما پا جائیں اور اس طرح کاروانِ انسانیت اس نصب العین کی طرف بڑھتا چلا جائے جو خالق کائنات نے اس کے لئے متعین کیا ہے۔ یہ پروگرام صرف اپنی آزاد مملکت میں ممکن تھا۔ ہندو اوّل تو اسے (مذہب اسلام کو) مٹا ہی دینا چاہتا تھا جس کا طریق کار اس کے نزدیک یہ تھا کہ مسلمانوں کو تبدیلی مذہب سے ہندو بنا لیا جائے اور جب انہوں نے دیکھا کہ یہ اسکیم ناقابلِ عمل ہے تو پھر انہوں نے اپنے مقصد کے حصول کے لئے دوسرا راستہ اختیار کیا۔ یعنی یہ کہ اسلام کو ایک پرائیویٹ مذہب کی حیثیت سے زندہ رہنے کی اجازت دی جائے اور مذہب بھی ایسا جسے ہندو مذہب پر کوئی فوقیت حاصل نہ ہو چنانچہ مسٹر گاندھی نے ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم سے جو تعلیمی اسکیم مرتب کرائی تھی (جسے وارد ھا کی تعلیمی اسکیم کہا جاتا تھا) اُسے متعارف کراتے ہوئے مسٹر گاندھی نے کہا تھا کہ :-

میں اس بات کو سختی سے مہلک اور خطرناک سمجھتا ہوں کہ بچوں کو یہ سکھایا جائے کہ اُن کا مذہب دیگر تمام مذاہب پر برتری رکھتا ہے یا جس مذہب کے وہ قائل ہیں بس وہی مذہب سچا ہے۔

(ہندوستان ٹائمز ۱۹۳۸ء - ۷-۷)

نیشنلسٹ مسلمان ظاہر ہے کہ ہندو اپنی اس اسکیم کو تنہا رائج نہیں کر سکتا تھا۔ اس مقصد کے لئے اُس نے چیدہ چیدہ مسلمان لیڈروں کو اپنے ساتھ ملایا جن میں سرِ فہرست متحدہ قومیت کے حامی "نیشنلسٹ علماء" کا نام سامنے آتا ہے، چنانچہ اس گروہ کے سرخیل۔ مولانا حسین احمد (مرحوم) کا ارشاد تھا کہ :-

ایسی جمہوری حکومت جس میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی سب شامل ہوں، حاصل کرنے کے لئے سب کو متفقہ کوشش کرنی چاہیئے ایسی مشترکہ آزادی اسلام کے اصول کے عین مطابق ہے اور اسلام اس آزادی کی اجازت دیتا ہے۔ (زمزم ۳۸ - ۷ - ۷)

جہاں تک ہندوستان کی سیکولر جمہوری حکومت میں مذہبی آزادی کی ضمانت کا تعلق تھا، مولانا مرحوم اس سلسلے میں فرماتے تھے "کانگریس" میں ہمیشہ ایسی تجاویز آتی اور پاس ہوتی رہتی ہیں جن کی وجہ سے مذہب اسلام کے تحفظ اور وقار کو ٹھیس نہ لگے"۔ (متحدہ قومیت اور اسلام - صفحہ ۶۱)

ہم دیکھ چکے ہیں کہ ہندوؤں کو ایک خطرہ افغان مسلمانوں کی طرف سے بھی تھا۔ خود مسٹر گاندھی کو بھی اس کا شدید احساس تھا، چنانچہ انہوں نے مسلسل جدوجہد اور بیشمار روپیہ خرچ کر کے صوبہ سرحد میں کانگریس حکومت قائم کرا دی اور وہاں اس تصور کو عام کر دیا کہ مذہب خدا اور بندے کے درمیان ایک نجی معاملہ ہے۔ سیاست سے اس کو کوئی تعلق نہیں۔ وہاں اس تحریک کے علمبردار سرخپوشوں کے قائد خان عبدالغفار خان تھے جو سرحدی گاندھی کے نام سے متعارف تھے اور جنہیں اپنے اس لقب پر بڑا فخر تھا۔ یوں ہندوؤں نے بزعم خویش اپنے آپ کو اُس خطرہ سے محفوظ کر لیا، جو اسلام کے بحیثیت دین کے قیام کی صورت میں (ان کے خیال کے مطابق) لاحق ہو سکتا تھا۔

اِن تصریحات سے بھی واضح ہے کہ تحریک پاکستان میں کشمکش کی بنیاد دین اور مذہب کے اختلاف پر مبنی تھی۔ مسلمان اسے دین کی شکل میں قائم کرنے کا مطالبہ کرتے تھے اور ہندو اس کی مخالفت کرتے تھے وہ چاہتا تھا کہ ہندوستان میں اسلام صرف مذہب کی حیثیت سے زندہ رہے۔ علامہ اقبالؒ نے اسے "معرکۂ دین و وطن" کے نام سے تعبیر کیا تھا۔ ہم نے دیکھا ہے کہ مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) نے فرمایا تھا کہ "ایسی جمہوری حکومت جس میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی سب شامل ہوں، حاصل کرنے کے لئے سب کو متفقہ کوشش کرنی چاہیئے ایسی مشترکہ آزادی اسلام کے اصول کے عین مطابق ہے" اس کے جواب میں علامہ اقبالؒ نے کھٹ سے کہا کہ:-

مسلمان ہونے کی حیثیت سے انگریز کی غلامی کے بندھن توڑنا اور اس کے اقتدار کو ختم کرنا ہمارا فرض ہے لیکن اس آزادی سے ہمارا مقصد یہ نہیں کہ ہم آزاد ہو جائیں بلکہ ہمارا اولین مقصد یہ ہے کہ اسلام قائم رہے اور مسلمان طاقتور بن جائیں۔ اس لئے مسلمان کسی ایسی حکومت کے قیام میں مددگار نہیں ہو سکتے۔ جس کی بنیادیں انہی اصولوں پر ہوں جن پر انگریزی حکومت قائم ہے۔ ایک باطل کو مٹا کر دوسرے باطل کو قائم کرنا چہ معنی دارد؟ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان کلیتہً نہیں تو ایک بڑی حد تک دارالاسلام بن جائے۔ لیکن اگر آزادیٔ ہند کا نتیجہ یہ ہو کہ جیسا دارالکفر اب ہے ویسا ہی رہے یا اس سے بھی بدتر بن جائے، تو مسلمان ایسی آزادیٔ وطن پر ہزار لعنت بھیجتا ہے۔ میں ایسی آزادی کی راہ میں لکھنا، بولنا، روپیہ صرف کرنا، لاٹھیاں کھانا، جیل جانا، گولی کا نشانہ بننا، سب حرام سمجھتا ہوں۔ قطعاً حرام۔ (معرکۂ دین و وطن)

علامہ اقبالؒ اس پیغام خداوندی کو اپنی زندگی کے آخری سانس تک عام کرتے رہے (اسی کی نشر و اشاعت کے لئے اپریل ۱۹۳۸ء میں طلوع اسلام کا وجود عمل میں لایا گیا تھا) اس کے بعد یہ شمع قائدِ اعظمؒ کے ہاتھ میں آئی۔ آیئے ہم دیکھیں کہ انہوں نے ہندوؤں اور ان کے ہمنوا نیشنلسٹ مسلمانوں کے خلاف جو جنگ لڑی تھی۔ اس کی بنیاد (عام اصطلاح میں) سیاسی یا معاشی تھی یا وہ دین اور مذہب کے درمیان وہی کشمکش تھی جو ازل سے چلی آ رہی تھی۔ جس نے انتہائی شدت خدا کے آخری رسول نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور ہمایوں میں اختیار کر لی تھی اور جس کی صدائے بازگشت علامہ اقبالؒ کے پیغام حیات آفریں میں سنائی دی تھی اور جس کا نقیب طلوع اسلام تھا۔

جب قائدِ اعظمؒ نے اعلان کیا کہ مطالبہ پاکستان کی بنیاد اسلام کا تقاضا ہے تو اس پر مسٹر گاندھی نے اعتراض کیا کہ مسٹر جناح خواہ مخواہ مذہب کو سیاست میں گھسیٹ لاتے ہیں اس کے جواب میں قائدِ اعظمؒ نے مسٹر گاندھی کے نام ایک تفصیلی خط لکھا جس میں کہا کہ:-

آج آپ اس سے انکار کرتے ہیں کہ قومیت کی تشکیل میں مذہب بہت بڑا عنصر ہے لیکن جب خود آپ سے یہ سوال کیا گیا تھا کہ زندگی میں آپ کا مقصود کیا ہے؟ وہ کونسی قوت محرکہ ہے جو ہمیں آمادہ بہ عمل کرتی ہے کیا وہ مذہب ہے یا سیاست یا عمرانی اصلاح۔ تو آپ نے کہا تھا کہ وہ خالص مذہبی جذبہ ہے تو قائدِ اعظمؒ نے فرمایا کہ آپ تمدنی

سیاسی، معاشی اور خالص مذہبی امور کو الگ الگ شعبوں میں تقسیم کر ہی نہیں سکتے جس مذہب کو نوعِ انسان کے معاملات سے واسطہ نہیں میں اُسے مذہب ہی تسلیم نہیں کرتا۔ مذہب انسان کے ہر معاملہ کیلئے اخلاقی بنیاد مہیا کرتا ہے۔ اگر مذہب نہ ہو تو انسانی اعمال اس بنیاد سے محروم رہ جاتے ہیں اور جب زندگی ایسی بنیاد سے محروم رہ جائے تو وہ انسانی زندگی نہیں محض شور و غل آرائی اور ہنگامہ پروری بن کر رہ جاتی ہے جس میں شور و شغب تو بہت ہوتا ہے لیکن مقصد کچھ نہیں ہوتا۔

(تقاریر قائد اعظمؒ جلد اوّل ص ۱۳۸-۱۳۹)

آپ نے اس خط سے دیکھا کہ مسٹر گاندھی اپنے لئے سیاست کا جذبۂ محرکہ مذہب قرار دیتے تھے لیکن جب مسلمان اپنے سیاسی مطالبہ کی بنیاد اسلام ٹھہراتے تھے تو مسٹر گاندھی اعتراض کرتے تھے کہ مذہب کو سیاست سے کیا واسطہ! ہم دیکھ چکے ہیں کہ ہندو لیڈر برملا اعلان کرتے تھے کہ آزاد ہندوستان میں ہندو دھرم کا راج قائم ہو۔ کانگریسی ہندوؤں کی طرف سے اس کا یہ جواب دیا جاتا تھا کہ وہ لوگ متشدد قسم کے ہندو ہیں۔ کانگریس کا یہ نصب العین نہیں، لیکن اسکے باوجود بعض اوقات غیر شعوری طور پر ان کی زبان پر بھی ایسی باتیں آجاتی تھیں جن سے واضح ہو جاتا تھا کہ یہ نصب العین متعصب ہندوؤں ہی کا نہیں تھا، خود کانگریس اور مسٹر گاندھی کے دل میں بھی یہی مقصد تھا مثلاً اُس زمانے کی کانگریس کے جنرل سیکرٹری، اچاریہ کرپلانی نے اگست ۱۹۳۷ء میں اپنے ایک طویل بیان میں کہا تھا کہ:-

ہندو فلسفۂ حیات

گاندھی جی نے کانگریس کو بتایا کہ ہمارا کام صرف یہ نہیں کہ ملک کی سیاسی باگ ڈور انگریز کے ہاتھ سے چھین کر اہل ملک کے ہاتھ میں دیں بلکہ سب سے ضروری چیز یہ ہے کہ ہم اپنی تمام جدوجہد کی بنیاد کسی ایسے فلسفۂ حیات پر رکھیں جس کے دائرے میں ہماری معاشرت، اخلاق اور روحانیت سب کچھ داخل ہو۔ بالفاظ دیگر ہماری تحریک کو صرف سیاسی نہیں ہونا چاہیئے بلکہ اسے روحانی اور اعلیٰ فلسفۂ زندگی کے ماتحت ہونا چاہیئے تاکہ اس جدوجہد سے نہ صرف ہماری زندگی متاثر ہو بلکہ ہماری زندگی کا ایک نیا باب شروع ہو جسے ہم تاریخ کا نیا دور کہہ سکیں۔ زندگی کا یہی نیا باب اور نیا دور ہے جسے گاندھی جی کانگریس کے ذریعے ہندوستان میں لانا چاہتے ہیں۔

ہندوؤں کی بالعموم اور مسٹر گاندھی کی بالخصوص یہی دورُخی پالیسی تھی جس کے پیش نظر قائد اعظمؒ کو جھنجھلا کر کہنا پڑتا تھا کہ "ہمیں جس حریف سے پالا پڑا ہے وہ گرگٹ کی طرح اپنا رنگ بدلتا رہتا ہے" اور یہ کہ "مشکل یہ ہے کہ گاندھی جی کا مقصد وہ نہیں ہوتا جو وہ زبان سے کہتے ہیں اور جو ان کا حقیقی مقصد ہوتا ہے، اُسے کبھی زبان پر نہیں لاتے" اور مذہب و سیاست کے متعلق ہندو کی یہی دو رنگی تھی جس کے پیش نظر علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ:-

نگہ دارد برہمن کارِ خود را — نمی گوید بکس اسرارِ خود را
بمن گوید کہ از تسبیح بگذر — بدوشِ خود برد زنّارِ خود را

ان کے مقابلے میں قائد اعظمؒ کی یہ کیفیت تھی کہ وہ اپنی ہر تقریر اور ہر بیان میں واضح الفاظ میں اعلان کرتے تھے

کہ ہمارا مطالبہ خالص دین پر مبنی ہے اور وہ مطالبہ ایک ایسی آزاد اور جداگانہ مملکت کا قیام ہے جس میں اسلام ایک عملی حقیقت بن کر سامنے آئے۔ میں ان کے بیانات اور تقاریر کو گذشتہ ستائیس سال سے مسلسل دہراتا چلا آرہا ہوں بایں ہمہ ان کی اہمیت اور وقت کا تقاضا ہے کہ ان میں سے چند ایک، ایک بار پھر قوم کے سامنے پیش کر دی جائیں تاکہ اس حقیقت کے سمجھنے میں کوئی شک و شبہ نہ رہے کہ مملکت پاکستان کا مطالبہ خالص دینی بنیادوں پر تھا۔ مثلاً انہوں نے ۲۱ نومبر ۱۹۴۵ء کو فرنٹیر مسلم لیگ کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:۔

قائد اعظمؒ کے ارشادات

۱۔ مسلمان اس لئے پاکستان کا مطالبہ کرتے ہیں کہ اس مملکت میں اپنے ضابطۂ زندگی، اپنے ثقافتی نشوونما اور روایات، اور اسلامی قوانین کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔

(تقاریر حصہ دوم۔ صفحہ ۳۳۳)

۲۔ انہوں نے ۲۲ نومبر ۱۹۴۵ء کو ایڈورڈز کالج پشاور کے طلباء کے سپاسنامہ کا جواب دیتے ہوئے کہا:۔

ہم ہندو اور مسلمان دو قومیں ہیں۔ نہ صرف یہ کہ ہمارا مذہب ایک دوسرے سے مختلف ہے بلکہ ہمارا کلچر بھی الگ الگ ہے۔ ہمارا مذہب ہمیں ایک ایسا ضابطۂ حیات عطا کرتا ہے جو زندگی کے ہر شعبے کو محیط ہے۔ ہم اسی ضابطے کے آئیڈیل کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں لیکن ہندو لیڈرشپ رام راج قائم کرنا چاہتی ہے اور اس راج میں مسلمانوں کو اقلیت کی پوزیشن دینا چاہتی۔

۳۔ انہوں نے ۱۳ نومبر ۱۹۳۹ء کو ریڈیو پر قوم کے نام پیغام عید نشر کیا تھا۔ اس میں انہوں نے قرآنی تعلیم کے مختلف گوشوں کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا تھا:۔

معاشی احیاء ہو یا سیاسی آزادی، اسے آخر الامر زندگی کے کسی گہرے مفہوم پر مبنی ہونا چاہیئے اور مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ ہمارے نزدیک زندگی کا وہ گہرا مفہوم اسلام اور روح اسلام ہے۔

(تقاریر جلد اوّل صفحہ ۱۰۸)

۴۔ پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی سالانہ کانفرنس منعقدہ ۱۸ مارچ ۱۹۴۴ء میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا۔

پاکستان کا مطالبہ اب کروڑوں مسلمانوں کے نزدیک جزو ایمان بن چکا ہے۔ یہ اب ایک نعرہ نہیں رہا۔ مسلمانوں نے اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے کہ ان کی حفاظت، نجات، اور مقدر کا واحد ذریعہ پاکستان ہے۔ وہ پاکستان کہ جب وہ وجود میں آگیا تو ساری دنیا میں یہ آواز گونج اٹھے گی کہ ہاں اب ایک ایسی مسلم اسٹیٹ کا قیام عمل میں آگیا ہے۔ جو اسلام کے ماضی کی، درخشندہ عظمت و شوکت کا احیاء کرے گی۔

(تقاریر - جلد دوم صفحہ ۸۵)

۵۔ انہوں نے اسی حقیقت کو دس مارچ ۱۹۴۱ء کو مسلم یونیورسٹی یونین علی گڑھ سے خطاب کرتے ہوئے ایسے مختصر، جامع اور دوٹوک الفاظ میں واشگاف کیا کہ جن کے بعد اس سلسلے میں کچھ اور کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ انہوں نے فرمایا کہ:۔

اگر آپ چاہتے ہیں کہ اس ملک سے اسلام کا نام و نشان نہ مٹ جائے تو اس کے لئے پاکستان نہ صرف یہ کہ ایک عملی نصب العین ہے بلکہ یہی اور صرف یہی واحد نصب العین ہے

(تقاریر جلد اوّل صفحہ نمبر ۲۶۷)

۶۔ پھر انہوں نے ۲۳ مارچ ۱۹۴۵ء کو پاکستان ڈے کی تقریب پر پیغام دیتے ہوئے کہا:۔

ہماری حفاظت، نجات اور عزت و آبرو پاکستان ہے۔ یاد رکھو! اگر ہم اس جدوجہد میں ناکام رہ گئے تو ہم تباہ ہو جائیں گے اور پھر اس برِ صغیر میں مسلمانوں کا اور اسلام کا نشان تک باقی نہیں رہے گا۔

(تقاریر جلد دوم - ۲۵۵)

کتنی عظیم حقیقت ہے جسے اس سوز و گداز سے زبان پر لایا گیا ہے کیا اس کے بعد بھی اس حقیقت کے سمجھنے میں کوئی شبہ رہ سکتا ہے کہ ہم نے پاکستان کیوں مانگا تھا اور ہندو اس کی مخالفت کیوں کرتا تھا؟ اس سلسلے میں ایک نقطہ اور بھی وضاحت طلب ہے۔ اِن تقاریر میں قائدِ اعظمؒ نے بار بار اسلام کا نام لیا ہے، اپنے مزاج کے اعتبار سے بھی اور پھر ایک اعلےٰ پایہ کا قانون دان ہونے کی جہت سے بھی، وہ اِس حقیقت کو خوب جانتے تھے کہ اسلام کا لفظ ایسا وسیع المعنی ہو چکا ہے کہ ہر شخص اور ہر فرقہ اس کا الگ الگ مفہوم لیتا ہے۔ اس بنا پر وہ جانتے تھے کہ جب اِسلام کو مملکتِ پاکستان کی بنیاد قرار پانا ہے تو اسلام کا بنیادی مفہوم متعین ہونا چاہیئے چنانچہ انہوں نے مختلف مواقع پر واضح الفاظ میں بتا دیا کہ اِس مملکت کی بنیاد خدا کی کتاب عظیم قرآن کریم پر ہونی چاہیئے۔ انہوں نے ۱۹۴۵ء میں ملت کے نام عید کے پیغام میں فرمایا:۔

قرآن کریم بطور ضابطۂ حیات

اس حقیقت سے سوائے جہلاء کے ہر شخص واقف ہے کہ قرآن کریم مسلمانوں کا بنیادی ضابطۂ زندگی ہے جو معاشرت، مذہب، تجارت، عدالت، فوج، دیوانی، فوجداری اور تعزیرات کے ضوابط کو اپنے اندر لیئے ہوئے ہے۔ مذہبی رسوم ہوں یا روزمرّہ کے معمولات۔ رُوح کی نجات کا سوال ہو یا بدن کی صفائی کا اجتماعی حقوق کا سوال ہو یا انفرادی واجبات کا۔ عام اخلاقیات ہوں یا جرائم۔ دنیاوی سزا کا سوال ہو یا آخرت کے مؤاخذہ کا۔ ان سب کے لئے اس میں قوانین موجود ہیں۔ اسی لئے نبی اکرمؐ نے حکم دیا تھا کہ ہر مسلمان قرآن کا نسخہ اپنے پاس رکھے اور اس طرح اپنا مذہبی پیشوا آپ بن جائے۔

(تقاریر جلد دوم صفحہ ۳)

دسمبر ۱۹۴۳ء میں کراچی میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا۔ اُس کے آخری اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے پہلے خود ہی یہ سوال اٹھایا:۔

وہ کونسا رشتہ ہے جس سے منسلک ہونے سے تمام مسلمان جسدِ واحد کی طرح ہیں؟ وہ کونسی

چٹان ہے جس پر اُن کی ملت کی عمارت استوار ہے، وہ کون سا لنگر ہے جس سے اُمت کی کشتی محفوظ کر دی گئی ہے۔

اس کے بعد انہوں نے خود ہی ان سوالات کا جواب ان الفاظ میں دیا:-

وہ بندھن، وہ رشتہ، وہ چٹان، وہ لنگر، خدا کی کتاب عظیم قرآن مجید ہے مجھے یقین ہے کہ جُوں جُوں ہم آگے بڑھتے جائیں گے ہم میں زیادہ سے زیادہ وحدت پیدا ہوتی جائے گی۔ ایک خدا ایک رسول، ایک کتاب، فلہٰذا، ایک قوم۔ (تقاریر جلد دوم۔ صفحہ ۵۰)

۱۹۴۱ء میں جامعہ عثمانیہ، حیدر آباد (دکن) کے طلبہ کے اس سوال کے جواب میں کہ اسلامی حکومت کے تصور کی امتیازی خصوصیت کیا ہے، انہوں نے جو کچھ فرمایا تھا، وہ ہمارے ہاں کلاسک بن چکا ہے۔ آپ بھی اُن الفاظ کو متعدد بار سُن چکے ہوں گے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ان کی اہمیت کا تقاضا ہے کہ انہیں بار بار دھرایا جائے۔ انہوں نے کہا تھا کہ:-

اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیش نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے، جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے اور حکمرانی کے لئے آپ کو لامحالہ علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہوتی ہے۔

قائداعظمؒ نے اس بنیادی حقیقت کو اس طرح بار بار دھرایا کہ مطالبۂ پاکستان کے مخالفین کو اس باب میں کسی قسم کا شک و شبہ یا ابہام نہیں رہا تھا۔ یکم نومبر ۱۹۴۱ء کو لدھیانہ میں اکھنڈ بھارت کانفرنس منعقد ہوئی جس کی صدارت ہندوؤں کے مشہور راہنما، مسٹر منشی نے کی۔ انہوں نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا

نہیں کچھ معلوم بھی ہے کہ پاکستان ہے کیا؟ نہیں معلوم تو سُن لیجئے کہ پاکستان سے مفہوم یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ ملک کے ایک یا ایک سے زیادہ علاقوں میں اپنے لئے ایسے مسکن بنا لیں جہاں طرز حکومت، قرآنی اصولوں کے ڈھانچے میں ڈھل سکے اور جہاں اُردو ان کی قومی زبان بن سکے، مختصر الفاظ میں یوں سمجھئے کہ پاکستان مسلمانوں کا ایک ایسا خطۂ ارض ہوگا جہاں اسلامی حکومت قائم ہوگی۔ (ٹریبیون - ۱۹۴۱-۱۱-۲)

اور یہی تھی ہندوؤں کی طرف سے مطالبۂ پاکستان کی مخالفت کی بنیادی وجہ۔ یہ مخالفت نہ سیاسی تھی نہ معاشی (طوعاً و کرھاً ہی سہی) ہندو اسے تو گوارا کر سکتا تھا کہ اسلام ایک مذہب کی حیثیت سے باقی رہ جائے لیکن وہ اسے برداشت ہی نہیں کر سکتا تھا کہ یہ ایک دین کی شکل اختیار کرے خواہ وہ ایک جداگانہ مملکت کی حدود کے اندر ہی کیوں نہ ہو یہی وجہ مخالفت جس کی بنا پر مکہ کے قریش یہ دیکھ ہی نہیں سکتے تھے کہ مسلمانوں کی قرآنی حکومت قائم ہو جائے، خواہ وہ مدینہ ہی میں کیوں نہ ہو۔

لیکن ہندوؤں اور ان کے ساتھ نیشنلسٹ مسلمانوں کی شدید ترین مخالفت کے باوجود پاکستان

کے قیام کا فیصلہ ہو گیا - اُس وقت ہندوؤں کی قلبی کیفیت کیا تھی؟ اس کا اندازہ اس کہرام سے لگ سکتا ہے جو انہوں نے اس وقت مچایا - ہندو مہاسبھا کے (اُس زمانہ کے) صدر ڈاکٹر شیام پرشاد مکرجی نے جولائی ۱۹۴۷ء میں اعلان کیا کہ:-

تقسیم ہند کے وقت

> ہمارا نصب العین یہ ہونا چاہیئے کہ پاکستان کو پھر سے ہندوستان کا حصہ بنا لیا جائے - اس حقیقت سے متعلق میرے دل میں ذرا سا بھی شبہ نہیں کہ ایسا ہو کر رہے گا خواہ یہ معاشی دباؤ سے ہو یا سیاسی دباؤ سے، یا اس کے لئے دیگر ذرائع اختیار کرنا پڑیں -
>
> (آرگنائزر مورخہ ۳-۷-۴۷)

دیوان چمن لال کا شمار ہندوؤں کے اعتدال پسند طبقہ میں کیا جاتا تھا - انہوں نے یہ کہہ کر ہندوؤں کی ڈھارس بندھائی تھی کہ:-

> میں نا امید ہونے والوں میں سے نہیں ہوں - اس لئے مجھے یقین ہے کہ تقسیم ہند ایک عارضی سا حادثہ ہے - اس کے باوجود ہم تیس کروڑ ہندوؤں کو اس مقصد کے حصول کے لئے جان تک دے دینے کے لئے تیار رہنا چاہیئے - یہ بہت غلط ہو گا کہ ہم اپنی قوم کو لوریاں دے دے کر اسی طرح سلائے رکھیں جس طرح ہم نے اس وقت تک سلائے رکھا اور جس کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے - ہم میں بنیادی نقص یہ ہے کہ ہم ضرورت سے زیادہ امن پسند واقع ہوتے ہیں - (ایضاً)

پاکستان، انگریز، کانگریس اور مسلم لیگ کے باہمی سمجھوتے سے وجود میں آیا تھا - ۳ر جون ۱۹۴۷ء کو تقسیم ہند کا اعلان ہوا اور ۱۶ر جون کو آل انڈیا کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے حسب ذیل ریزولیشن پاس کیا:

> آل انڈیا کانگریس کمیٹی کو پورا پورا یقین ہے کہ جب موجودہ جذبات کی شدت میں کمی آ جائے گی تو ہندوستان کے مسئلے کا حل صحیح صحیح پس منظر میں دریافت کر لیا جائے گا اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے دو الگ الگ قومیں ہونے کا باطل نظریہ مردود قرار پائے گا -

اس مقام پر، میں پھر دہرا دینا چاہتا ہوں کہ ہندوستان میں کشمکش یہ تھی کہ کانگریس کا دعوےٰ یہ تھا کہ اب سیکولر نظامِ حکومت آ چکا ہے جس کی رو سے ایک مملکت کے اندر بسنے والے تمام باشندے ایک قوم شمار ہوتے ہیں اس کے برعکس مسلم لیگ کا یہ دعویٰ تھا کہ اسلام کا اپنا نظام ہے جس کی رو سے ایک ہی ملک میں بسنے والے مسلم اور غیر مسلم دو الگ الگ قومیں قرار دیئے جاتے ہیں - ہمارا مطالبہ اسلام ہی کے اس تقاضے کی بنیاد پر ہے - کانگریس کے مذکورہ بالا ریزولیشن میں آپ نے دیکھا کہ انہوں نے اسلام کے اس نظریہ کو باطل اور مردود قرار دیا تھا - اس سے بھی واضح ہے کہ اس ساری کشمکش کی بنیاد مذہب کے اختلاف پر تھی -

ضمناً (مولانا) ابوالکلام آزاد (مرحوم) نے کانگریس کے اس اجلاس کی روئداد کی تفصیل

اپنی کتاب (INDIA WINS FREEDOM) میں درج کی ہے اس میں انہوں نے کہا ہے اور باصد حسرت و یاس کہا ہے کہ کانگریس کے ہندو ممبر، حتیٰ کہ مہاتما گاندھی جی بھی تقسیم ہند پر راضی ہو گئے۔ لیکن مولانا صاحب اور سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خان صاحب نے آخری وقت تک اس کی مخالفت کی حتیٰ کہ خان صاحب نے ہندوؤں کو یہاں تک کہہ دیا کہ پاکستان کا مطالبہ مان کر تم ہمیں بھیڑیوں کے حوالے کر رہے ہو۔ کیا ہمارے تعاون اور خدمات کا یہی صلہ ہے؟

بہرحال تقسیم ہند کا فیصلہ ہو گیا اس فیصلے پر کانگریس کی طرف سے پنڈت جواہر لال نہرو نے دستخط کیے۔ وہ ایک طرف اس فیصلہ پر دستخط کر رہے تھے اور دوسری طرف قوم سے کہہ رہے تھے۔

> ہماری اسکیم یہ ہے کہ ہم اس وقت مسٹر جناح کو پاکستان بنا لینے دیں اور اس کے بعد معاشی طور پر یا دیگر انداز سے ایسے حالات پیدا کرتے جائیں۔ جن سے مجبور ہو کر مسلمان گھٹنوں کے بل جھک کر ہم سے درخواست کریں کہ ہمیں پھر سے ہندوستان میں مدغم کر لیجئے۔

(PAKISTAN FACES INDIA -- PAGE -99)

جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں میرے اس خطاب کا بنیادی نقطہ یہ ہے کہ ہندوؤں کی اس مخالفت کی اصل وجہ یہ تھی کہ انہیں اس پر تو اعتراض نہیں تھا کہ مسلمان اسلام پر ایک مذہب کی حیثیت سے عمل پیرا رہیں لیکن وہ اسے برداشت ہی نہیں کر سکتے تھے کہ اسلام ایک زندہ نظامِ حیات یعنی دین کی شکل اختیار کر جائے خواہ وہ کسی الگ خطۂ زمین ہی میں کیوں نہ ہو۔ دیکھئے کہ تقسیم ہند کے وقت ہندوؤں نے اپنے اس جذبہ کا اظہار کن الفاظ میں کیا تھا؟ قائد اعظمؒ کی وفات کے بعد، ہندوستان ٹائمز نے اپنی ۱۹ اکتوبر ۱۹۴۸ء کی اشاعت کے مقالۂ افتتاحیہ میں لکھا:-

> پاکستان، بالخصوص مشرقی بنگال کی اقلیتوں کو اتنا خوف وہراس اور کسی چیز سے پیدا نہیں ہوا جتنا اس حقیقت سے کہ پاکستان کے راہنماؤں نے متعدد بار اعلان کیا ہے کہ وہ پاکستان میں اسلامی اصول و روایات کے مطابق ایک اسلامی مملکت قائم کرنا چاہتے ہیں۔

اس کے بعد اس نے (اسی مقالۂ افتتاحیہ میں) کہا کہ:-

> اگر کشمیر کا مسئلہ پُر امن طریق سے طے ہو جائے اور پاکستان اسلامی اسٹیٹ کے خیال کو ترک کر دے اور اپنے سامنے ایک جمہوری ریاست کی تشکیل کا نصب العین رکھے تو اس سے پاکستان اور ہندوستان اور ہندوؤں اور مسلمانوں میں خوشگوار تعلقات کا ایک نیا دور شروع ہو جائے گا۔

اکتوبر ۱۹۴۹ء میں محترم لیاقت علی خاں (مرحوم) نے لندن میں ایک اجتماع سے خطاب کرتے

ہوئے کہا کہ :-

پاکستان ایک اسلامی اسٹیٹ ہے اور ہم نے تہیہ کر لیا ہے کہ وہ ان اصولوں پر قائم کی جائے گی جو ہمیں اسلام نے سکھائے ہیں۔ (ہندوستان ٹائمز ۲۵-۱۰-۴۸)

اس پر اسی اخبار نے اپنی ۲۸ اکتوبر کی اشاعت کے مقالہ افتتاحیہ میں لکھا کہ:

تقسیم ہند کے وقت سے ہندوستان کے نیتاؤں نے اس امر کا اعلان کر رکھا ہے کہ ہندوستان میں سیکولر حکومت ہوگی لیکن سرحد کے اُس پار کے لیڈر پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ پاکستان اسلامی اسٹیٹ ہوگا۔۔۔ چنانچہ ابھی پچھلے دنوں مسٹر لیاقت علی خان نے کہا ہے کہ پاکستان ایک اسلامی اسٹیٹ ہے۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ ہندو اس پر رضامند تھا کہ مسلمان اپنی الگ مملکت قائم رکھیں لیکن شرط یہ ہے کہ وہ اس میں سیکولر نظام رائج کریں — یعنی وہ اسلام پر مذہب کی حیثیت سے کاربند رہیں۔ انہیں اعتراض اس پر تھا کہ پاکستان کو اسلامک اسٹیٹ بنایا جائے اور یہی وہ اختلاف کی بنیاد تھی جس کی وجہ سے وہ پاکستان کے جداگانہ وجود کو مٹا دینا چاہتے تھے (مثلاً) راجہ مہندر پرتاپ نے ۱۹۵۰ء میں اپنی قوم کو مشورہ دیا تھا کہ :-

جب تک پاکستان کا وجود ختم نہیں ہو جاتا — ہمارا ملک کوئی ترقی نہیں کر سکتا۔ حالات اس طرح بدل رہے ہیں کہ مجھے یقین ہوتا چلا جا رہا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان میں جنگ لابدی ہو گئی ہے۔ بنابریں میں حکومتِ ہند کو مشورہ دوں گا کہ وہ افغانستان کو اپنے ساتھ ملا کر پاکستان کو ختم کر دے۔

(ویر بھارت ۲۱-۱۲-۵۰)

یہ تو ۱۹۵۰ء کی بات ہے، بھارت کے سابق چیف جسٹس مسٹر مہاجن نے اُسی زمانے میں یہ انکشاف بھی کیا تھا کہ "ہندوستان نے دسمبر ۱۹۴۷ء میں فیصلہ کر لیا تھا کہ پاکستان پر حملہ کر دیا جائے لیکن بعض داخلی مصالح کے پیشِ نظر اس فیصلہ پر عملدرآمد نہ ہو سکا"۔ بھارت نے اپنے اس فیصلہ پر عمل درآمد ۱۹۶۵ء میں کیا لیکن اللہ کا شکر ہے کہ اس جنگ میں وہ اپنے مذموم عزائم میں ناکام رہا۔ ہندوستان اور خود پاکستان کی طرف سے اس جنگ کی مختلف توجیہات بیان کی گئیں اور کی جاتی ہیں، وہ بھی اپنی جگہ درست ہو سکتی ہیں لیکن اس کی بنیادی وجہ یہ تھی جو میرے اس درس کا عمودی نکتہ ہے اور جسے ہندوستان کے اس زمانہ کے وزیرِ دفاع مسٹر چوہان نے بیان کیا تھا۔ اُس نے کہا تھا کہ :-

پاکستان اور ہندوستان کے درمیان اُسی دن سے مخاصمت کی بنیاد رکھ دی گئی تھی جس دن پاکستان معرضِ وجود میں آیا تھا۔ پاکستان اور بھارت کے درمیان آئیڈیالوجی کا اختلاف ہے اس کے سوا کوئی اختلاف نہیں۔ اور یہ اختلاف، اور دشمنی مہینے یا ہفتہ بھر کی نہیں بلکہ سالہا سال تک رہے گی۔ بھارت کو اس کے لئے ایک تازہ اور فیصلہ کن جنگ کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔

آپ نے غور فرمایا کہ ہندوستان اور پاکستان میں بنائے نزاع کیا ہے۔ سیاسی یا معاشی نہیں نظریہ کا اختلاف اور یہی وہ نظریاتی اختلاف ہے جسے مٹانے کے لئے مسٹر چوہان نے ۱۹۶۵ء میں کہا تھا کہ بھارت کو اس کے لئے ایک فیصلہ کن جنگ کی تیاری کرنی چاہیئے۔

۱۹۷۱ء کی جنگ

اور یہ جنگ اُس نے ۱۹۷۱ء میں کی اور اس کے لئے میدان کارزار، مشرقی بنگال کا منتخب کیا۔ یہ اس لئے کہ وہ خطہ زمین اس نظریاتی اختلاف میں بھارت کا ہمنوا ہو چکا تھا۔ اس کی تفصیل ابھی آپ کے سامنے آئے گی۔ سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ پاکستان کے متعلق دہلی کی وزیراعظم، مسز اندرا گاندھی کے دل میں چھپے ہوئے جذبات کیا تھے۔ اُس نے سالہاسال تک ان جذبات کو اپنی زبان تک نہ آنے دیا (ہندو منافقت میں بڑا پختہ واقع ہوا ہے۔ علامہ اقبالؒ اس قسم کے منافقین کو "مخلص منافق" کہہ کر پکارا کرتے تھے) مسز گاندھی نے برسہابرس تک ان جذبات کو اپنے دل میں چھپائے رکھا اور سقوط ڈھاکہ سے ذرا پہلے اُس نے ان کا اظہار کیا۔ اس نے نومبر ۱۹۷۱ء میں علی گڑھ کے طلباء اور اساتذہ کے ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا:-

> میرے پتا، پنڈت نہرو تحریک آزادی کے ایک عظیم رہنما تھے۔
>
> وہ میرے سب کچھ تھے۔ وہ میرے شفیق باپ بھی تھے، استاد بھی، اور راہنما بھی۔ یہ سب اپنی جگہ درست ہے لیکن بھارت کی تاریخ ان کے اور ان کی جماعت، انڈین نیشنل کانگریس کے ایک بھیانک جرم کو کبھی معاف نہیں کرے گی۔ وہ جرم ہے بھارت کی تقسیم۔ انہوں نے سُرگ باش پٹیل اور ہندو مہاسبھا کے دباؤ میں آکر ایک ایسا فیصلہ قبول کر لیا جس نے بھارت ماتا کے جسم کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ یہ بات مجھے بڑے دُکھ سے کہنی پڑ رہی ہے اس لئے کہ وہ میرے پتا تھے۔ لیکن اس سے زیادہ وہ بھارت کے ہر دلعزیز رہنما بھی تھے آج مجھے اس حقیقت کا اظہار کرنا پڑ رہا ہے تو میں اُن کی بیٹی سے زیادہ، بھارت کی وزیراعظم کی حیثیت سے بھی بات کر رہی ہوں۔ میں یہ بات نہ بھی کہوں تو بھارت کی موجودہ نسل اور آنے والی نسلیں ہمیشہ کہتی رہیں گی۔ وہ پنڈت نہرو اور انڈین نیشنل کانگریس کے اس جرم کو کبھی معاف نہیں کریں گی۔
>
> (بحوالہ 'مشرق' - ۷۲-۴-۶)

سقوط ڈھاکہ کے بعد

سقوط ڈھاکہ کے بعد بھارت نے بہت بڑا جشن منایا۔ پارلیمان نے اس کامیابی پر مسز اندرا گاندھی کی خدمت میں ہدیہ تبریک پیش کیا۔ آپ کو معلوم ہے کہ مسز اندرا گاندھی نے اس کے جواب میں کیا کہا تھا۔ اُس نے یہ نہیں کہا تھا کہ ہم نے بہت بڑا میدان مارا ہے اُس نے یہ بھی نہیں کہا تھا کہ ہم نے ایک ملک فتح کر لیا ہے۔ اُس نے کہا یہ تھا کہ:-

> یہ کامیابی، نہ ہماری فوجوں کی کامیابی ہے اور نہ ہی حکومت کی کامیابی۔ یہ کامیابی ہے۔ حق پر مبنی نظریہ کی، اُس نظریہ کے خلاف جو باطل پر مبنی تھا۔ مسلمانوں نے تحریک پاکستان کی بنیاد ایک باطل نظریہ پر رکھی تھی ہم انہیں بار بار سمجھاتے رہے کہ اُن کا نظریہ غلط ہے۔ یہ کامیاب نہیں

ہو سکتا۔ انہوں نے نہ مانا اور اپنی ضد پر قائم رہے۔ اب پچیس سال کے تجربہ نے بتا دیا ہے کہ جو کچھ ہم کہتے تھے وہ حق تھا اور اُن کا نظریہ باطل۔ یہ ان کے باطل نظریہ کی شکست ہے۔

کیا اس کے بعد بھی کسی شبہ کی گنجائش رہ جاتی ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کی اس کشمکش کی بنیاد، نہ سیاسی ہے نہ معاشی۔ یہ خالصتاً نظریاتی ہے اور نظریاتی یہ کہ ہندو چاہتا ہے کہ مسلمان اسلام پر کاربند رہنا چاہتے ہیں تو اُس پر مذہبی حیثیت سے کاربند رہیں، دین کی حیثیت سے نہیں۔ یعنی اپنے ہاں سیکولر نظامِ حکومت رائج کریں۔

میں نے ابھی ابھی کہا تھا کہ ۱۹۷۱ء کی جنگ کے لئے ہندو نے مشرقی پاکستان کا خطۂ زمین اس لئے منتخب کیا تھا کہ وہاں کے باشندے نظریاتی طور پر ہندو کے ہمنوا ہو چکے تھے۔ چنانچہ سقوطِ ڈھاکہ کے بعد جب مسز اندرا گاندھی وہ کچھ کہہ رہی تھیں۔ تو دوسری طرف اس زمانے میں، بنگلہ دیش کے قائم مقام صدر، مسٹر نذرالاسلام یہ فرما رہے تھے:-

> ہماری یہ فتح، نہ کسی فوج کی فتح ہے، نہ کسی ملک کی۔ یہ فتح ہے حق کی باطل پر۔ یہ فتح ہے ایک صحیح نظریہ کی غلط نظریہ پر۔ تقسیمِ ہند سے پہلے، سرپھرے مسلمانوں نے یہ دعوے کیا کہ قومیت کا مدار مذہب کا اشتراک ہے، وطن کا اشتراک نہیں، اور حکومت کی بنیاد مذہب پر ہے، سیکولر نہیں۔ وہاں اِن لوگوں کو لاکھ سمجھایا گیا کہ یہ نظریہ غلط ہے اور ناممکن العمل اس پر اصرار نہ کرو۔ لیکن وہ نہ مانے اور اپنے غلط مفروضہ کی بنیاد پر ایک جداگانہ قوم بن کر ایک الگ مملکت کے بانی بن گئے لیکن چوبیس سال کے تجربہ نے ثابت کر دیا کہ جو نظریہ یہ لوگ پیش کر رہے تھے وہ باطل تھا اور حق وہی تھا، جو ان کے مخالفین پیش کر رہے تھے۔ سقوطِ ڈھاکہ نے اس حقیقت پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی۔ اب یہ شہادت، تاریخ کے صفحات پر، ہمیشہ کے لئے منقوش رہے گی۔ ہم ان راہ گم کردہ لوگوں سے اب بھی کہیں گے کہ وہ اس باطل نظریہ کو ترک کر کے وطن کے اشتراک کی بناء پر پھر سے ہندوستانی قوم کا جزو بن جائیں اور مذہب کو سیاست میں گھسیٹنے کی کوشش نہ کریں۔ ورنہ جو حشر آج مشرقی پاکستان کا ہوا ہے وہی کل مغربی پاکستان کا بھی ہو گا۔ حقائق کسی کے جھٹلانے، جھوٹے ثابت نہیں ہو جایا کرتے۔

خود مجیب الرحمٰن نے پاکستان سے رہا ہونے کے بعد ڈھاکہ پہنچنے پر کہا کہ:-

> میری قوم سیکولرازم، سوشلزم اور جمہوریت کے نظریات کی حامی ہے۔ مجھ سے اکثر پوچھا جاتا ہے کہ میری پالیسی اور اندرا گاندھی کی پالیسی میں اس قدر توافق کیوں ہے اس کا جواب صاف اور واضح ہے کہ ہم دونوں کے نصب العین، زاویۂ نگاہ، اور اقدارِ حیات ایک ہیں۔
>
> (پاکستان ٹائمز۔ ۱۱ جنوری ۱۹۷۲ء)

ڈھاکہ سے شائع ہونے والے ہفتہ وار اخبار FORUM نے اپنی ۳۰ جنوری ۱۹۷۱ء کی اشاعت میں لکھا تھا کہ:-

۷ دسمبر ۱۹۷۰ء تک یہ سمجھا جاتا تھا کہ اہلِ پاکستان میں وجہِ جامعیت مذہب ہے۔ انتخابات نے اس ملمع کی قلعی کھول دی اور نظریہ پاکستان کی وہ تمام نگاہ فریب خوشنمائیاں جنہیں قدیم رجعت پسند اور استحصال پرور طبقہ۔ اس شدّ و مد سے پیش کرتا تھا، افسانہ بن کر رہ گئی ہیں اس کے بعد اس نے اپنی ۲۷ فروری ۱۹۷۲ء کی اشاعت میں لکھا تھا کہ:-

جب اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ مشرقی اور مغربی پاکستان کو متحد نہیں رکھ سکے تو پھر سوچیے کہ بلوچ، پٹھان اور پنجابیوں کو کون سا رشتہ متحد رکھ سکے گا۔ اسلام کی یاد تو یقیناً ایسا نہیں کر سکے گی۔

مغربی پاکستان میں:- ہم نے اوپر دیکھا ہے کہ مسٹر نذرالاسلام نے کہا تھا کہ اگر پاکستان اپنے نظریہ پر قائم رہا تو جو حشر آج مشرقی پاکستان کا ہوا ہے وہی کل کو مغربی، پاکستان کا بھی ہو گا۔ اس کا یہ کہنا محض جذبات پر مبنی نہیں تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا جو بنیادی سبب تھا۔ یعنی سیکولرازم کے جراثیم کا وبائی شکل اختیار کر جانا۔ وہی جراثیم مغربی پاکستان میں بھی پرورش پا رہے تھے اور ان کی پرورش گاہ بنیادی طور پر وہی خطۂ زمین تھا جہاں نظریہ پاکستان کی منظم طور پر مخالفت کی گئی۔ یعنی صوبہ سرحد کی زمین۔ چنانچہ سقوطِ ڈھاکہ کے بعد خان عبدالغفار خان نے ٹائمز آف انڈیا کے نمائندہ۔ مسٹر دلیپ مکرجی کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا کہ:

چند سال پہلے کا پاکستان رہ چکا ہے مغربی پاکستان میں چار قومیتوں کے درمیان رشتہ کے لئے اسلام کافی نہیں رہے گا۔ اس کے لئے سیکولر بنیادوں پر رشتوں کی تعمیر کرنی ہوگی۔

(جسارت کراچی ۲۷-۳-۷۲)

دوسری طرف خان عبدالولی خان صاحب نے اکتوبر ۱۹۷۲ء کو بریڈ فورڈ میں پاکستانیوں کے ایک منتخب اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ:-

دو قومی نظریہ ختم ہو چکا ہے۔ اسلام کی باتیں ڈیڑھ ہزار سال پرانی اور فرسودہ ہیں۔ ۲۵ سال کے تجربہ نے ثابت کر دیا ہے کہ نظریۂ پاکستان غلط تھا۔ برِصغیر کی تقسیم کے وقت اس نظریہ کو غلط طور پر اساس بنایا گیا تھا۔ لیکن کسی بھی قوم کو زیادہ دیر تک محض جذباتی نعروں سے بیوقوف نہیں بنایا جا سکتا ...... ماؤنٹ بیٹن نے جب اپنے اختیارات پاکستان کے گورنر جنرل کو تفویض کئے تھے تو ہم اس وقت بھی اس کی مخالفت کی تھی۔ اس وقت ہمیں غدار کہا گیا تھا۔ لیکن آج دنیا نے دیکھ لیا کہ پاکستان اسلام کے نام پر بنا اور اسلام ہی کے نام پر ٹوٹا ہے۔ (نوائے وقت ۱۲ اکتوبر ۱۹۷۲ء)

اور ولی خان صاحب نے یہ بات اپنی کسی ایک تقریر میں ہی نہیں کہی۔ وہ شروع سے یہی کہتے چلے آ رہے ہیں حتیٰ کہ وہ جس سیاسی پارٹی کے سربراہ ہیں۔ یعنی نیشنل عوامی پارٹی۔ اُس کے منشور میں یہ شق درج ہے کہ ان کی پارٹی برسرِ اقتدار آئے گی تو حکومت کا نظام سیکولر ہو گا۔ ضمناً حال ہی

میں جب خان عبدالولی خان سے کہا گیا کہ وہ پاکستان سے علیحدگی کا مسلک کیوں اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ تو انہوں نے کہا کہ علیحدگی کا مسلک کوئی انوکھا مسلک نہیں ہے :-

خود قائدِ اعظمؒ علیحدگی کی تحریک کے بانی تھے۔ انہوں نے ہندوستان سے علیحدگی اختیار کی اب اگر کوئی اور قائدِ اعظم کے پیروکار بنتے ہیں تو سزاوار ٹھہرتے ہیں۔

(نوائے وقت - ۲۰ جولائی ۱۹۷۴ء)

یہ دلیل ان کے دل میں چھپے ہوئے جذبات کو کس طرح بے ساختہ زبان پر لے آئی ہے، لیکن ایسا کہتے وقت انہوں نے یہ نہیں سوچا کہ قائدِ اعظمؒ کی علیحدگی اور ان کی علیحدگی میں کیا فرق ہے؟ وہ علیحدہ ہوئے تھے، سیکولرازم کے ہندوانہ نظریے کو چھوڑ کر اسلام کے نظریہ کی طرف آنے کے لئے اور یہ علیحدہ ہونا چاہتے ہیں۔ اسلام کے نظریہ کو چھوڑ کر سیکولرازم کی طرف جانے کے لئے۔

ببیں تفاوتِ رہ از کجا است تا بہ کجا

(مثال کے طور پر) ایک علیحدگی ایک ہندو کی ہے جو ہندومت کو چھوڑ کر اسلام کی طرف آتا ہے اور ایک علیحدگی ایک مسلمان کی ہے جو اسلام کو چھوڑ کر ہندو دھرم اختیار کر لے۔ علیحدگی کا عمل دونوں میں مشترک ہے لیکن دونوں کی وجہ علیحدگی میں جو فرق ہے وہ کفر اور اسلام کا فرق ہے، زمین اور آسمان کا فرق ہے۔ علاوہ بریں یہ بھی دیکھئے کہ ولی خان صاحب، قائدِ اعظمؒ کے عمل علیحدگی کے ہمیشہ مخالف رہے اور آج تک مخالف ہیں وہ عمل علیحدگی کو قائدِ اعظمؒ کے لئے تو معیوب اور ناقابلِ معافی جرم قرار دیتے ہیں لیکن انہی کے پیروکار بن کر اس جرم کے مرتکب ہونا چاہتے ہیں اور اسے قابلِ فخر بات قرار دیتے ہیں! آپ نے منطق ملاحظہ فرمائی؟

بہرحال میں کہہ یہ رہا تھا کہ ہندو کی طرف سے مخالفت ہے تو اس بات کی کہ مسلمان اسلام کو ایک عملی ضابطۂ حیات کی شکل کیوں دینا چاہتے ہیں۔ اگر مسلمان سیکولر نظام اختیار کر لیں تو اسے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ آپ غور کیجئے کہ ہندو چلاتا چلا آرہا تھا کہ پاکستان بھارت کا اٹوٹ انگ ہے تقسیم ملک سے اس کے جسم کے دو ٹکڑے کر دیئے گئے ہیں بلکہ راج گوپال اچاریہ کے الفاظ میں ان کی ماتا کے جسم کو کاٹ کر رکھ دیا گیا ہے۔ مشرقی پاکستان کی حالت یہ ہے کہ وہ جس وقت جی چاہے اسے ہندوستان میں شامل کر سکتے ہیں اور اس طرح ان کے انگ کا ایک بڑا حصہ، جو اس سے کٹ چکا تھا، پھر سے بھارت کا انگ بن سکتا ہے لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ ان کی کامیابی کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ اس ملک نے سیکولرازم کا نظریہ اختیار کر لیا ہے۔

کشمیر کا مسئلہ کشمیر کے نزاع کی بنیاد بھی یہی ہے کہ پاکستان کا دعوےٰ یہ ہے کہ دو قومی نظریے کی بنیاد پر کشمیر کو پاکستان کا حصہ ہونا چاہیئے۔ ہندوستان کہتا ہے کہ یہ نظریہ ہی غلط ہے چنانچہ حال ہی میں شیخ محمد عبداللہ کے ساتھ اندرا گاندھی کی جو مصالحت ہوئی ہے اس کی بنیاد یہ ہے کہ شیخ صاحب نے سیکولرازم کے نظریہ کا اعلان کر دیا ہے۔ یکم جولائی ۱۹۷۴ء کو انگریزی روزنامہ

(PATRIOT) دہلی نے سرینگر سے ایک خبر شائع کی ہے کہ شیخ عبداللہ نے ہندو آبادی والے علاقہ رعنا وادی میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ "پاکستانی مقبوضہ کشمیر (یعنی آزاد کشمیر) بھارت کا جزو لاینفک ہے۔ شیخ صاحب نے کہا کہ پاکستان نے کشمیریوں کو حق خود اختیاری سے محروم کر دیا جب کہ ہندوستان نے انہیں یہ حق دیا۔ انہوں نے اسی تقریر میں کہا کہ محاذِ رائے شماری اور کانگریس میں کوئی فرق نہیں۔ دونوں کا ایمان، سوشلزم، سیکولرازم اور اہنسا پر مودھرم (یعنی عدم تشدد) پر ہے۔

(بحوالہ ہفت روزہ انصاف، راولپنڈی۔ ۱۸ جولائی ۱۹۷۲ء)

آپ نے دیکھا کہ یہاں بھی وجہ ہمنوائی سیکولرازم ہے۔

ہندوستان پاکستان کے ساتھ گفتگوئے مصالحت اور باہمی مذاکرات کے لئے معاہدۂ شملہ کا حوالہ دیتا ہے اور کبھی معاہدہ دہلی کا۔ لیکن اس کے باوجود مصالحت کی طرف ایک قدم نہیں بڑھنے پاتا۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس کی بنیادی وجہ کیا ہے؟ سقوطِ ڈھاکہ کے بعد ہندوستان کی وزارتِ خارجہ کی طرف سے، اخبارات کو ایک رپورٹ بغرضِ اشاعت بھیجی گئی تھی۔ اس میں کہا گیا تھا کہ:-

> دو قوموں والا نظریہ ہی برِصغیر کے امن و آشتی میں رخنہ اندازی کا موجب تھا۔ اب چونکہ وہ نظریہ مسمار ہو چکا ہے تو ہندوستان کی نظروں میں اب ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات کے معمول پر آنے اور صلح اور دوستی کے امکانات روشن ہو گئے ہیں بنگلہ دیش کے قائم ہونے سے یہ تصور ختم ہو گیا ہے کہ ریاستیں مذہب کی بنیاد پر بن سکتی ہیں۔
>
> (رائٹر نیوز ایجنسی۔ بحوالہ چٹان مورخہ ۱۵ مئی ۱۹۷۲ء)

وقت زیادہ ہو گیا ہے اس لئے میں، عزیزانِ من! اس داستان کو طول نہیں دینا چاہتا۔ میرا خیال ہے کہ ان تصریحات سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آگئی ہوگی کہ پاکستان کے ساتھ ہندوؤں کی مخالفت کی بنیاد، نہ سیاسی ہے، نہ معاشی، اس کی بنیاد نظریاتی ہے۔ یعنی ہندو، صرف اُس وقت پاکستان کی مخالفت چھوڑ سکتا ہے (بشرطیکہ اس میں دیگر وجوہات حائل نہ ہوں) جب یہ اپنے اسلامی نظریہ کو چھوڑ کر سیکولرازم کا نظریہ اختیار کر لے۔ مسلمانوں میں سے جس نے بھی سیکولرازم کے نظریہ کی حمایت کی (خواہ وہ تقسیم ہند سے پہلے تھا یا بعد) ہندوؤں نے اُسے اپنا سمجھا۔ جس نے ایسا نہیں کیا اُسے وہ اس وقت بھی اپنا دشمن سمجھتے تھے اور آج بھی اُسی طرح دشمن سمجھتے ہیں۔

ہندو ایسا کیوں چاہتا ہے

آخر میں میں اس سوال کا ذرا تفصیلی جواب دینا چاہتا ہوں کہ ہندو کے لئے یہ تصور سوہانِ رُوح کیوں بن جاتا ہے کہ قرآنی اصول و اقدار ایک مملکت کی شکل میں، عملی پیکر اختیار نہ کر لیں؛ جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں اس کی وجہ وہی ہے جس سے قریش کو یہ تصور، چین کی نیند نہیں سونے دیتا تھا کہ ملتِ اسلامیہ کی اپنی مملکت نہ قائم ہو جائے خواہ وہ مدینہ ہی میں کیوں نہ ہو۔ قریش کی پوزیشن یہ تھی کہ وہ بڑی سرمایہ دار قوم تھی اس کے تجارتی قافلے یمن سے شام تک رواں دواں چلتے تھے۔ مکہ سارے عرب اور اردگرد کے علاقوں

کی مرکزی منڈی تھی، جوان کی تحویل میں تھی۔ بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ اس سارے علاقہ کی تجارت کا مرکزی کنٹرول ان کے ہاتھ میں تھا۔

قریش کی مثال

کعبہ، تمام اہلِ عرب کی مرکزی پرستش گاہ تھا اور قریش اس کے متولی (یا مہاجن) تھے۔ اس سے انہوں نے ایسا مقدس اور ارفع مقام حاصل کر رکھا تھا، کہ اس زمانے میں جب رہزنی اور قزاقی عام تھی، ان کے تجارتی قافلوں کی طرف کوئی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا تھا علاوہ بریں کعبہ کی آمدنی بھی کچھ کم نہ تھی۔

پھر انہوں نے انسانوں کو اس طرح نسلی طبقات میں تقسیم کر رکھا تھا کہ کوئی ان پیدائشی حدود کو توڑ ہی نہیں سکتا تھا۔ ان طبقات میں قریش کو بلند ترین مقام حاصل تھا۔

غلامی ان کے معاشرہ کا معمول تھی جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کے سارے کام کاج غلام کرتے تھے (اور ان کی حالت مویشیوں سے بھی بدتر تھی) اور گھروں میں لونڈیاں تھیں جن کی عام خرید و فروخت ہوتی تھی۔

یہ تھے وہ مفادات جن کے حامل قریش تھے۔ مکہ میں جب قرآنی تعلیم عام ہوئی تو انہوں نے بھانپ لیا کہ اس کی رو سے اُن سے وہ سب کچھ چھن جائے گا جس کے وہ اس طرح غاصب بنے بیٹھے تھے۔ اس سے ان کی نہ مذہبی سیادت باقی رہے گی نہ اقتصادی قیادت۔ نہ نسلی تفوق باقی رہے گا نہ سیاسی عمادت۔ اس سے ان کے قلبی اضطراب کی کیا کیفیت تھی، علامہ اقبالؒ نے اس کا نقشہ اپنے مخصوص محاکاتی انداز میں بڑی جامعیت سے کھینچا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ ان احساسات و جذبات کو دل میں لئے، قریش کا نمائندہ، ابوجہل کعبہ میں گیا۔ اس کے غلاف کا دامن تھاما اور انتہائی عجز والحاح سے اپنے خداؤں۔ یعنی کعبہ میں ایستادہ بتوں کے حضور یوں نوحہ گر ہوا کہ:۔

سینۂ ما از محمدؐ داغ داغ — از دمِ او کعبہ را گُل شد چراغ
مذہبِ او قاطعِ ملک و نسب — از قریش و منکر از فضلِ عرب
در نگاہِ او یکے بالا و پست — با غلامِ خویش بر یک خواں نشست
احمراں با اسوداں آمیختند — آبروئے دودمانے ریختند
ایں مساوات، ایں مواخات اعجمی است — خوب می دانم کہ سلمان مزدکی است

اور اس کے بعد اپنے خداؤں سے رو رو کر فریاد کی کہ ہمیں اس انقلاب کی تباہی سے محفوظ رکھنے کا سامان کرو ورنہ نہ ہم رہیں گے نہ تم۔ جب تک یہ تعلیم نظری حیثیت لئے رہی۔ انہوں نے اس خطرہ کو اپنے سے زیادہ قریب نہ دیکھا اس لئے اجتماعی طور پر اس کی مخالفت نہ کی جب یہ تعلیم مدینہ میں محسوس شکل اختیار کرنے لگی تو انہوں نے اس کے نتائج کو بے نقاب دیکھ لیا۔ انہیں صاف نظر آ گیا کہ جب مسلمانوں کا معاشرہ ان خطوط پر متشکل ہو گیا تو اس کے انسانیت ساز حیات بخش نتائج کو دیکھ کر، ساری دنیا ان کی طرف کشاں کشاں آ جائے گی اور اس سیل بے پناہ کے سامنے نہ قریش باقی رہیں گے نہ ان کے امتیازات و مفادات اس لئے انہوں نے سر دھڑ کی بازی لگا دی کہ یہ نظام عملاً متشکل نہ ہونے پائے۔

ہندو کی حالت

ہندوستان میں ہندوؤں کی بھی یہی حالت تھی۔ وہ دولت (لکشمی دیوی) کی پجاری، انتہائی سرمایہ پرست قوم تھی۔ ورنوں کے عقیدہ کی رُو سے انہوں نے انسانوں کو اس طرح طبقات میں تقسیم کر رکھا تھا کہ برہمن زادہ، پیدائشی کے ساتھ ہی دنیا بھر کی عظمت و احترام کا مالک قرار پا جاتا تھا، اور شودروں کی حالت غلاموں سے بھی بدتر تھی۔ وہاں کا اقتدار ہمیشہ برہمنوں کے ہاتھ میں رہا ہے اور اب بھی انہی کے ہاتھ میں ہے۔ اسلام کی یہ تعلیم ان کی نگاہ میں تھی کہ دنیا میں کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے انسان کو اپنا محکوم یا محتاج بنائے۔ احترامِ آدمیت ہر انسانی بچہ کا یکساں حق ہے۔ وہ وعظ و نصیحت تک تو اس تعلیم کو چنداں مضر نہیں سمجھتے تھے، لیکن اس حقیقت سے خوب باخبر تھے کہ اگر ان خطوط پر ایک معاشرہ متشکل ہو گیا اور بھارت ماتا کی پجلی ہوئی انسانیت نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا، تو اس سے وہاں ایسا انقلاب در آئے گا جو ان کے بالائی طبقہ کا سب کچھ بھسم کر کے رکھ دے گا۔ ہندو (اور انہی جیسے اور صیادانِ انسانیت) کا یہی وہ احساس تھا، جس کا اظہار، حضرت علامہؒ نے ارمغانِ حجاز ہی میں، اپنی اس نظم میں جس کا عنوان ہے۔ ابلیس کی مجلسِ شوریٰ۔ ابلیس کی زبان سے نہایت حسن کارانہ انداز سے کیا ہے۔ وہ اپنے مشیروں سے کہتا ہے کہ اس وقت تو ہمیں اس کا کوئی خطرہ نہیں کہ ہمارے غلبہ و تسلط میں ضعف آجائے گا کیونکہ، قرآن کا انقلاب انگیز پیغام مسلمانوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو چکا ہے اور وہ اسلام کے بھی ایک مذہب کی طرح پرستار ہیں۔

عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبرؐ کہیں

الحذر آئینِ پیغمبرؐ سے سو بار الحذر
حافظِ ناموسِ زن، مرد آزما، مرد آفریں

موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے
نے کوئی فغفور و خاقاں نے فقیرِ رہ نشیں

کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک و صاف
منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
بادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمیں

اقبالؒ نے پاکستان کا تصور اس لئے دیا تھا کہ اس خطۂ زمین میں شرعِ پیغمبرؐ آشکارا ہو جائے۔ ہندو اسی سے ڈرتا تھا۔ اسے اس میں اپنی موت نظر آتی تھی۔ اسی لئے وہ اس کی اسقدر مخالفت کرتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ مسلمانوں کو مذہبی آزادی کا جھنجھنا دے دیا جائے جس سے وہ اس قسم کے نظری مسائل میں الجھے رہیں کہ:-

ابنِ مریم مر گیا یا زندہ جاوید ہے
ہیں صفاتِ ذاتِ حق، حق سے جدا یا عینِ ذات

آنے والے سے مسیحِ ناصری مقصود ہے
یا مجدد جس میں ہوں فرزندِ مریم کے صفات

کیا مسلماں کیلئے کافی نہیں اس دور میں
یہ الٰہیات کے ترشے ہوئے لات و منات

مسلمان کو ان مسائل و معتقدات کی آزادی دے دی جائے اور مملکت کا نظام سیکولر رکھا جائے وہ انہیں مذہب کی پوری پوری آزادی دیتا تھا لیکن اسے ایک ثانیہ کے لئے بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ یہ اپنی

ایسی مملکت قائم کرلیں جس میں احترامِ انسانیت ایک زندہ حقیقت بن کر سامنے آجائے۔

یہ تھی ہندو کی وجۂ مخاصمت۔ اور اصل یہ ہے کہ اس کا یہ خدشہ موہوم نہیں تھا۔ مبنی بر حقیقت تھا۔ اگر یہاں فی الواقعہ قرآنی معاشرہ قائم ہو جاتا تو اس کے درخشندہ نتائج کو دیکھ کر وہاں کی پسی ہوئی انسانیت جھنجھلا کر اٹھتی۔ اور برہمنی کابوس کو خس و خاشاک کی طرح اڑا دیتی۔ ہندو نے پہلے تو یہ کوشش کی کہ مسلمانوں کی الگ مملکت قائم ہی نہ ہو۔ اور جب وہ اس میں ناکام رہ گیا تو اس سازش میں مصروف ہو گیا کہ یہاں قرآنی نظام قائم نہ ہونے پائے۔ اس میں وہ ابھی تک کامیاب ہے۔ اس کے نتیجہ میں وہ مملکت پاکستان کا آدھا حصہ تو ہتھیا کر لے ہی گیا ہے۔ باقی آدھے کے درپے تخریب ہے۔

ہماری بدنصیبی

لیکن ہماری بدنصیبی کی بھی کوئی حد نہیں۔ ہندو، پاکستان کو اسلامی مملکت سمجھ کر اس کے پیچھے پڑا ہوا ہے اور ہم اس کی مخالفت کے تھپیڑے پے درپے کھا رہے ہیں۔

دوسری طرف کیفیت یہ ہے کہ پاکستان نظری طور پر اسلامی مملکت ضرور ہے لیکن عملاً ابھی تک اسلامی مملکت نہیں بنا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم اُن خوشگواریوں اور سرفرازیوں سے محروم ہیں، جو مملکت کے فی الواقعہ اسلامی ہونے کا فطری نتیجہ تھیں۔ یوں ہم دونوں طرف سے پٹ رہے ہیں۔ پاکستان کے عملاً اسلامی مملکت نہ بننے کی وجوہات کیا ہیں، اس کی تفصیل طویل ہے (میں انہیں اکثر بیان کرتا رہتا ہوں) اس وقت اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ جتنی جماعتیں تحریکِ پاکستان کی مخالف تھیں، وہ سب، بالواسطہ یا بلاواسطہ ہندو کی اس کوشش کو کامیاب بنانے میں ممد و معاون ہیں کہ یہاں قرآنی معاشرہ قائم نہ ہونے پائے اور نظامِ حکومت سیکولر رہے۔

سیکولر نظام کیا ہے؟

سیکولر نظام کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں؟ یہی نا کہ:-

۱۔ ملک کے اندر بسنے والے مسلم اور غیر مسلم۔ اشتراکِ وطن کی بنا پر، ایک قوم تسلیم کئے جائیں۔

۲۔ مذہبی آزادی ہر ایک کو حاصل ہو۔ یعنی عقائد اور عبادات سے متعلق معاملات کی آزادی، اور اس امر کی آزادی کہ شخصی قوانین، ہر فرقہ کی اپنی اپنی فقہ کے مطابق ہوں اور

۳۔ ملکی قوانین جمہوری طریق سے مرتب کئے جائیں۔

علماء کا طرزِ عمل

غور کیجئے کہ کیا پاکستان میں ابھی تک عملاً یہی نظام رائج نہیں؟ کہا جائے گا کہ ہندوستان میں نیشنلسٹ علماء بے شک سیکولر نظام کے حامی تھے لیکن پاکستان میں تو وہ اس کے حامی نہیں۔ یہاں یہ سب، متفقہ طور پر، یہ مطالبہ کرتے چلے آرہے ہیں کہ پاکستان میں قوانین کتاب و سنت کے مطابق وضع و نافذ ہوں۔ ان کے متعلق کیسے کہا جا سکتا ہے کہ یہ بھی سیکولر نظام کے ممد و معاون ہیں! یہ اعتراض بظاہر بڑا وزنی دکھائی دیتا ہے۔ لیکن اس میں ایک ایسی گرہ ہے کہ جب تک وہ کھل کر سامنے نہ آئے، بات سمجھ میں نہیں آ سکتی۔ وہ گرہ یہ ہے کہ ایک طرف یہ حضرات یہ مطالبہ کرتے ہیں (اور ان کا یہ مطالبہ آئینِ پاکستان

کے اندر شامل بھی ہو چکا ہے) کہ پاکستان کا کوئی قانون کتاب و سنّت کے خلاف نہیں ہو گا۔ اور دوسری طرف وہ یہ بھی اعلان کرتے ہیں کہ :-

> کتاب و سنت کی رو سے، ملکی قوانین کا کوئی ضابطہ ایسا مرتب نہیں ہو سکتا جسے تمام فرقے متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کر لیں۔

یہ اعلان مودودی صاحب کی طرف سے اگست ۱۹۷۰ء میں شائع ہوا تھا (بحوالہ ایشیا، ۲۳ اگست ۱۹۷۰ء) علماء پاکستان میں سے کسی نے نہ تو اُس وقت اس کی تردید کی اور نہ ہی اِس وقت تک کسی نے اسے چیلنج کر کے یہ کہا ہے کہ مودودی صاحب غلط کہتے ہیں۔ ایسا ضابطہ قوانین مرتب ہو سکتا ہے!

آپ سوچیے کہ ایک ایسا مطالبہ پیش کرنا جس پر عملدرآمد ناممکن ہو، اس کا نتیجہ کیا ہو گا؟ ظاہر ہے کہ کوئی ملک ضابطۂ قوانین کے بغیر چل نہیں سکتا۔ جب کتاب و سنت کے مطابق متفق علیہ ضابطہ قوانین مرتب نہیں ہو سکے گا تو حکومت لامحالہ اپنے طور پر قوانین مرتب کرے گی۔

مصطفیٰ کمال کی ترکی میں یہی ہوا تھا! اس نے وہاں کے علماء سے کہا تھا کہ وہ ایک مدت معینہ کے اندر ایک متفق علیہ اسلامی ضابطۂ قوانین مرتب کر دیں۔ اور جب وہ ایسا کر نہ سکے تو اس نے اپنا مرتب کردہ ضابطہ نافذ کر دیا۔ لیکن جب اس نے اسے نافذ کر دیا، تو علماء حضرات نے شور مچانا اور فسادات برپا کرانے شروع کر دیئے کہ وہ قوانین غیر اسلامی ہیں! بعینہٖ یہی صورت یہاں پیدا کر دی گئی ہے۔ اس کے جو نتائج ہو سکتے ہیں، اُن کا احساس تھا جس کی بناء پر میں نے اِن حضرات کی خدمت میں عرض کیا

میری عرضداشت

تھا کہ یا تو آپ کتاب و سنت کے مطابق ایک متفقہ علیہ ضابطہ قوانین مرتب کر دیں۔ اور اگر آپ سمجھتے ہیں کہ ایسا کیا جانا ممکن نہیں، تو پھر اس پر اصرار نہ کریں۔ اس کے لئے کوئی دوسری بنیاد پیش کریں جو ممکن العمل ہو۔ میرے نزدیک وہ بنیاد یہ ہو سکتی ہے کہ پاکستان میں کوئی ایسا قانون نافذ نہیں ہو گا۔ جو قرآن مجید کی مقرر کردہ حدود کے ساتھ ٹکرائے اگر اس اصول کو تسلیم کر لیا جائے تو ایک متفق علیہ ضابطہ قوانین مرتب کیا جا سکتا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جو قانون۔ قرآن کے خلاف نہیں ہو گا۔ وہ سنتِ رسول ؐ کے بھی خلاف نہیں ہو گا۔

میرے خلاف پراپیگنڈہ

میرے پیش کردہ موقف کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ہی انہیں اس کا خطرہ تھا کہ اگر یہ آواز عام ہو گئی تو عوام ان سے اسکا مطالبہ شروع کر دینگے۔ اس کیلئے انہوں نے کوشش کی کہ ایسی فضا پیدا کر دی جائے کہ لوگ میری اس آواز کو سنیں ہی نہیں۔ اس کیلئے انہوں نے پراپیگنڈہ شروع کر دیا کہ یہ شخص منکرِ حدیث ہے۔ منکرِ سنت رسول ؐ اللہ ہے یہ رسول ؐ اللہ کو (معاذ اللہ صد معاذ اللہ) پوسٹ مین" کہہ کر پکارتا ہے [1]۔

---

[1] میں ان حضرات کیطرف سے عائد کردہ ہر جھوٹے الزام کو برداشت کر لیتا ہوں لیکن جب یہ اس قسم کا الزام مجھ پر لگاتے ہیں تو یقین مانیئے میرا کلیجہ شق ہو جاتا ہے۔ میرا جگر پھٹ جاتا ہے میرے دل پر چھریاں چل جاتی ہیں کہ جس شخص کی ساری عمر ناموس رسالتمآب ؐ کی حفاظت میں گذری ہو۔ جس کا ایمان ہو کہ حضور ؐ عالمِ انسانیت کے بلند ترین مقام پر فائز تھے جو حضور ؐ کے اُسوۂ حسنہ کے اتباع میں اپنی اور (عالمگیر انسانیت) کی نجات و سعادت سمجھتا ہو۔ اِس قسم کا الزام اِس کے جگر کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے نہیں رکھ دیگا تو اور کیا کریگا۔ لاکھوں نہیں تو ہزاروں صفحات میری تحریروں کے موجود ہیں اس قسم کا الزام عائد کرنے والوں سے کوئی تو پوچھے کہ میں نے یہ الفاظ کہاں لکھے ہیں: یہ اسکا کوئی جواب نہیں دے سکیں گے

تین نمازیں اور نو دن کے روزے بتاتا ہے۔ اُردو میں نماز پڑھاتا ہے۔ ایک نئے فرقہ کا بانی ہے آگے چل کر نبوّت کا دعوےٰ کرے گا۔ لہٰذا یہ کافر ہے۔ ملحد ہے۔ بے دین ہے۔

میرا مسلک

عزیزانِ من! ویسے تو میں نے ساری عمر کسی مصلحت کی خاطر اپنے عقائد و نظریات کو چھپایا ہے اور نہ ہی کبھی ملفیس دابہام سے کام لیا ہے۔ لیکن اب جب کہ میں عمر کے اس حصّے میں پہنچ رہا ہوں جہاں اِس کنارے کے مقابلے میں اگلا کنارہ زیادہ قریب ہو جاتا ہے، میں ایک بار پھر پوری وضاحت سے اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ میرے خلاف یہ سب جھوٹا پراپیگنڈہ ہے۔ میں نہ منکرِ حدیث ہوں نہ منکرِ سنت رسول اللہؐ۔ میری تصانیف میں سینکڑوں کی تعداد میں احادیث مقدسہ موتیوں کی طرح جگمگا رہی ہیں۔ میں نے نبی اکرمؐ کی سیرت طیبہ پر وہ کتاب لکھی ہے جو منفرد حیثیت رکھتی ہے اس کتاب کا نام 'معراجِ انسانیت' ہی، اس حقیقت کی شہادت ہے کہ میرے ایمان کی رُوح سے حضورؐ کا مقام کس قدر ارفع و اعلیٰ ہے۔ جہاں تک اتباع سنّت رسول اللہؐ کا تعلق ہے بحالاتِ موجودہ اس کی عملی شکل یہی ہے جس پر کاربند رہنے کی تاکید ہمارے علمائے کرام کرتے ہیں کہ نماز، روزہ وغیرہ ارکانِ اسلام کی ادائیگی اسی شکل میں کی جائے جو شکل (یا شکلیں) اُمّت میں متواتر چلی آ رہی ہیں۔ میں خود بھی اس کا اتباع کرتا ہوں اور دوسروں کو بھی اسی کا اتباع کرنے کی تلقین کرتا ہوں۔ اور بار بار کہتا رہتا ہوں کہ کسی شخص یا گروہ کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ ان میں کسی قسم کی تبدیلی کرے یا کوئی نیا طریقہ وضع کرے۔ میں البتہ یہ ضرور کہتا ہوں کہ خلافتِ راشدہ (یا خلافت علیٰ منہاجِ رسالتؐ) کا سلسلہ آگے چلنے سے رُک گیا تھا۔ وہ ہمیشہ کے لئے ختم نہیں ہو گیا۔ اس کا احیاء اب بھی کیا جا سکتا ہے۔ اسی کو میں اسلامی مملکت کہہ کر پکارتا ہوں اور اس کے سربراہ یا سنٹرل اتھارٹی کو مرکزِ ملت (جس طرح ابوبکر صدیقؓ ایک اسلامی مملکت کے سربراہ ہونے کی حیثیت سے مرکزِ ملت تھے) ارکانِ اسلام کی ادائیگی میں اس وقت جو اختلافات پائے جاتے ہیں، ان کی وجہ سے اُمّت میں تفرقہ پیدا ہو چکا ہے اور تفرقہ اسلامی تعلیم کے خلاف ہے۔ اگر خلافت علیٰ منہاجِ رسالتؐ (یعنی اسلامی مملکت) قرآن، حدیث (سنّت) فقہ وغیرہ کو سامنے رکھ کر، وحدتِ اُمّت کیلئے کوئی متفقہ دستور العمل مرتب اور رائج کر دے تو میرے نزدیک اس کا اتباع، اُمّت کیلئے اتباعِ شریعت ہوگا۔ میں نہ ہر مملکت کو اسلامی قرار دیتا ہوں اور نہ ہی اس کے امیر کو مرکزِ ملت۔ لیکن جب تک ایسا نہ ہو، میں تاکید کہتا ہوں کہ موجودہ طریقے جو رائج چلے آ رہے ہیں ان میں تبدیلی کرنے کا کسی کو حق حاصل نہیں۔

جب کچھ سال اُدھر، ایک صاحب نے اُردو میں نماز پڑھنے کی آواز اٹھائی تو اس کی سب سے پہلے اور مؤثر مخالفت میری طرف سے ہوئی۔ فرقہ بندی کو میں قرآن کریم کی نصِ صریح کی رو سے شرک سمجھتا ہوں، اس لئے خود کسی فرقے کا بانی کیسے بن سکتا ہوں۔ میرا تعلق کسی فرقہ سے بھی نہیں، نہ کوئی میرا اپنا فرقہ ہے۔ میں سیدھا سادہ مسلمان ہوں۔ باقی رہا (معاذ اللہ) نبوّت کا دعوےٰ، تو میں (فخریہ نہیں بلکہ بطورِ تحدیثِ نعمت) بتانا چاہتا ہوں کہ ہندوستان میں جو (غالباً) سب سے پہلا مقدمہ دائر ہوا تھا جس میں فیصلہ طلب

امر یہ تھا کہ ایک مسلمان، مرزائی ہوکر اسلام کے دائرہ سے خارج ہو جاتا ہے یا نہیں۔ تو عدالت (ڈسٹرکٹ جج بہاولپور) نے ۱۹۳۵ء میں یہ فیصلہ دیا تھا کہ ایسا شخص مرتد ہو جاتا ہے اور اس نے اپنے اس فیصلہ کا مدار، میرے ایک مضمون کو قرار دیا تھا یہ فیصلہ بار بار چھپ چکا ہے اور آج بھی مطبوعہ شکل میں عام ہو رہا ہے۔ اس میں میرا نام لیکر یہ سب کچھ لکھا گیا ہے۔ جس کا جی چاہے دیکھ لے۔ یہ چالیس سال پہلے کی بات ہے۔ اس کے بعد اب تک میں اس حقیقت کو مسلسل عام کر رہا ہوں کہ حضور نبی اکرم ؐ کے بعد، خدا سے وحی پانے کا سلسلہ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ختم ہو چکا ہے۔ ایسا دعوے کرنا الافتراء علی اللہ ہے۔ اس موضوع پر میری جامع تصنیف طباعت کے لئے تیار رکھی ہے۔ سوچئے کہ ایسے شخص کے متعلق یہ کہنا کہ یہ دعوئ نبوت کرے گا انتہائی ظلم اور جھوٹا پراپیگنڈہ نہیں تو اور کیا ہے؟ میں قرآنی حقائق پر غور و فکر کرتا ہوں اور اس کے نتائج قوم کے سامنے پیش کرتا چلا آرہا ہوں لیکن ایسا کرتے وقت ہمیشہ اس کا اعلان کرتا ہوں (اور یہ الفاظ میری قریب قریب ہر کتاب میں درج ہوتے ہیں) کہ میری یہ فکر نہ سہو و خطا سے منزہ ہے نہ حرفِ آخر۔ یہ قرآن سمجھنے کی انسانی کوشش ہے اور ہر انسانی کوشش کی طرح، اس میں سہو و خطا کا امکان ہے۔ ہو سکتا ہے کہ میرے یہ فکری نتائج، کسی دوسرے کے نظریات سے مختلف ہوں لیکن یہ کہاں کا اسلام ہے کہ جو نظریہ آپ کے نظریہ کے خلاف ہو، اسے کفر قرار دے دیا جائے۔ غلط اور صحیح کا کوئی خارجی معیار ہونا چاہیئے اور میرے نزدیک یہ معیار خدا کی کتاب ہے۔ جہاں تک کفر اور اسلام کا تعلق ہے۔ اس کے متعلق فیصلہ صادر کرنا اسلامی مملکت کا حق ہے۔ افراد کو اس کا حق حاصل نہیں۔

حرفِ آخر ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ میرے خلاف جتنے الزامات عائد کئے جاتے ہیں وہ سب جھوٹے پراپیگنڈہ پر مبنی ہیں اور مقصد اس سے ایسی فضا پیدا کرنا تھا جس میں لوگوں کو میری آواز سننے سے باز رکھا جائے اور میری وہ آواز یہ ہے کہ میں علماء حضرات سے کہتا ہوں کہ یا تو آپ کتاب و سنت پر مبنی ایسا ضابطہ قوانین مرتب کر دیں جسے یہاں کے تمام مسلمان متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کر لیں۔ اور اگر (جیسا کہ مودودی صاحب نے فرمایا ہے) ایسا کیا جانا ناممکن ہے تو اس کے لئے کوئی ایسی بنیاد پیش کریں جو قابل العمل ہو تاکہ یہاں ایک ایسا اسلامی ضابطہ قوانین مرتب اور نافذ ہو جس کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں ہو سکے۔ میرے نزدیک وہ بنیاد قرآن مہیا کر ہی سکتی ہے جو تمام نوعِ انسان کے لئے خدا کی طرف سے مکمل، غیر متبدل، واحد ضابطہ حیات ہے۔ اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو ہماری نئی نسل، یہ سمجھ کر کہ اسلام اب دنیا میں چلنے کے قابل ہی نہیں رہا، نظری اور عملی، ہر دو لحاظ سے، یہاں سیکولر نظام رائج کر دیگی اور اسکے بعد ہندو کیلئے اس حصۂ ملک کو جھپٹ لینا بھی اسطرح آسان ہو جائیگا جسطرح اس نے مشرقی پاکستان کو جھپٹ لیا ہے۔

آخر میں میں۔ عزیزانِ من! خون کے آنسوؤں کے ساتھ قائد اعظم کے ان الفاظ کو دہرانے پر مجبور ہوں جو انہوں نے تحریک پاکستان کے دوران ارشاد فرمائے تھے اور جنہیں میں پہلے بھی پیش کر چکا ہوں۔ انہوں نے کہا تھا کہ:-

> ہماری نجات، حفاظت، اور عزت و آبرو (کے تحفظ کا واحد ذریعہ) پاکستان ہے (یاد رکھیں) اگر ہم اس جدوجہد میں ناکام رہ گئے تو ہم تباہ ہو جائیں گے اور اس برِ صغیر میں مسلمانوں اور اسلام کا نام و نشان تک باقی نہیں رہے گا۔ (تقاریر۔ جلد دوم۔ صفحہ ۵۵۰)

اور میں یہ کہوں گا کہ اگر ہم یہاں قرآنی نظام قائم کرنے میں ناکام رہ گئے تو پھر یہاں مسلمانوں کی وہی حالت ہو جائے گی جو ہندوستان اور (اب) بنگلہ دیش کے مسلمانوں کی ہے اور یہاں وہی اسلام باقی رہ سکے گا جس کی اجازت اور آزادی ہندو دے گا۔ یعنی سیکولر نظام کے اندر والا اسلام۔ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) والا اسلام باقی نہیں رہے گا۔

(والسلام)

باب المراسلات

سیکولر حکومت کسے کہتے ہیں؟ ایک صاحب لکھتے ہیں کہ ہمارے زمانے میں سیکولر حکومت کی اصطلاح عام ہو رہی ہے لیکن اس کا کوئی متعین مفہوم سامنے نہیں آتا۔ کوئی کچھ کہتا ہے کوئی کچھ۔ اس ترجمہ عام طور پر لادینی حکومت کہا جاتا ہے لیکن سیکولرازم کے حامی کہتے ہیں کہ یہ غلط ہے۔ سیکولر حکومت میں خدا یا مذہب کا انکار نہیں ہوتا۔

کیا آپ بتائیں گے کہ سیکولر حکومت سے کیا مراد ہے اور دینی حکومت سے یہ کس طرح مختلف ہوتی ہے؟

طلوع اسلام: قرآنی نقطۂ نگاہ سے ایک مملکت وہ ہے جس میں جملہ کاروبار حکومت، خدا کی کتاب کے مطابق سرانجام پاتا ہے۔ یہ وہ نظام حکومت تھا جسے قائم کرنے کے لئے حضور نبی اکرمؐ سے ان الفاظ میں کہا گیا تھا کہ: فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ (۵/۴۸) ان میں کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم کرو۔ اس نظام میں انسانی زندگی کا کوئی شعبہ بھی کتاب اللہ کی حدود سے باہر نہیں رہتا۔ یہ انسانی زندگی کے ہر گوشے کو محیط ہوتی ہے۔ اسے اسلام کے عقیدۂ توحید پر مبنی دینی ریاست کہا جاتا ہے۔ مذہبی پیشوائیت کا اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا اس لئے یہ تھیاکریسی سے بھی مختلف ہوتی ہے۔

۲۔ دوسرا نظام حکومت وہ ہے جس میں کتاب اللہ تو ایک طرف۔ خدا کا نام تک بھی نہیں آنے پاتا۔ یہ کافرانہ نظام ہوتا ہے جس کے متعلق کہا کہ۔ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ (۵/۴۴) جو ما انزل اللہ کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے انہیں کافر کہا جاتا ہے۔ اشتراکی حکومتوں کا یہی نہج ہوتا ہے۔ کیونکہ مارکس کے فلسفہ کی بنیاد خدا کے انکار پر ہے۔ (اگرچہ سردست وہ، بنا بر مصلحت، مسلمانوں کو نماز روزہ وغیرہ کی اجازت دے دیتے ہیں) اسے سیکولر حکومت کہا جاتا ہے۔ لیکن یہ اس کی ایک قسم ہے۔ اس کی دوسری قسم کا ذکر آگے آتا ہے۔

۳۔ تیسری قسم کا نظام حکومت وہ ہے جس میں مذہب پرست لوگوں کو اعتقادات، عبادات اور پرسنل لاز اپنی مرضی سے اختیار کرنے کی اجازت ہوتی ہے۔ لیکن امور مملکت میں مذہب کو دخیل نہیں ہونے دیا جاتا اسے مذہب اور سیاست کی ثنویت (DUALISM) کہا جاتا ہے۔ قرآن اسے مشرکانہ انداز حکومت قرار دیتا ہے۔ یعنی زندگی کے ایک دائرہ میں خدا کو ماننا اور دوسرے دائرہ (سیاست) میں انسانوں کو صاحب اختیار

(AUTHORITIES -) تسلیم کرنا۔ سورۃ زمر میں ہے۔

وَإِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَحْدَهُ اشْمَأَزَّتْ قُلُوبُ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ وَإِذَا ذُكِرَ الَّذِينَ مِن دُونِهِ إِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُونَ ۝ (39/45)

جب ان سے خدائے واحد کا ذکر کیا جاتا ہے (یعنی کہا جاتا ہے کہ زندگی کے ہر شعبے میں صرف خدا کے احکام کا اتباع کرو) تو جو لوگ آخرت کے منکر ہیں، انہیں یہ بات بے حد ناگوار گذرتی ہے۔ لیکن جب خدا کے علاوہ اوروں کو بھی ساتھ شامل کر لیا جاتا ہے تو ان کی باچھیں کھل جاتی ہیں۔

یہ ہے توحید کے مقابلہ میں ثنویت کا شرک۔ مسلمانوں سے واضح الفاظ میں کہا گیا کہ تم ایسا نہ کرنا تمہارا دعویٰ یہی ہونا چاہیے کہ:

قُلِ اللَّهُمَّ فَاطِرَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ عَالِمَ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ أَنتَ تَحْكُمُ بَيْنَ عِبَادِكَ فِي مَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ۔ (39/46)

اے اللہ! تو فاطرِ ارض و سما ہے، عالم الغیب والشہادۃ ہے اور تجھے اور صرف تجھے یہ حق اور اختیار حاصل ہے کہ جن امور میں انسان اختلاف کریں۔ ان میں فیصلہ کرے۔

ثنویت کا نظام جسے قرآن نے مشرکانہ اندازِ حکومت کہا ہے۔ آج کل کی جمہوریت میں رائج ہے۔ وہ اسے سیکولر کہتے ہیں۔ اس سے واضح ہے کہ سیکولر نظام دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک وہ جس میں خدا کا نام تک نہیں آنے پاتا اور دوسرا وہ جس میں مذہبی آزادی حاصل ہے لیکن کاروبارِ مملکت انسانوں کے وضع کردہ قوانین کے مطابق چلایا جاتا ہے اس دائرہ میں "خدا" کو دخیل نہیں ہونے دیا جاتا۔ قرآن کریم کی رُو سے سیکولر نظام دونوں قسم کے باطل ہیں۔ لیعنی کافرانہ بھی اور مشرکانہ بھی لیکن چونکہ شرک کو وہ سنگین ترین جرم (ظلم عظیم (31/13)) قرار دیتا ہے۔ اس لئے وہ سیکولر نظام جس میں مذہبی آزادی ہوتی ہے اس کے نزدیک سب سے زیادہ مردود قرار پاتا ہے۔ یہ اس لئے کہ کافرانہ سیکولر نظام میں مسلمانوں کو دھوکا نہیں دیا جا سکتا لیکن مشرکانہ سیکولر نظام میں مسلمانوں کو مطمئن کرا دیا جاتا ہے کہ انہیں مذہبی آزادی حاصل ہے اور یہی اسلام کا تقاضا ہے۔ یہی وہ فریب خوردگی یا ذہنی آوارگی ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن مجید کہتا ہے کہ أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ (2/85) کیا تمہاری کیفیت یہ ہے کہ تم کتاب کے ایک حصہ (اعتقادات، عبادات، شخصی قوانین) پر ایمان رکھتے ہو۔ اور اس کے دوسرے حصہ (متعلقہ امورِ مملکت) سے انکار کرتے ہو فَمَا جَزَاءُ مَن يَفْعَلُ ذَٰلِكَ مِنكُمْ إِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يُرَدُّونَ إِلَىٰ أَشَدِّ الْعَذَابِ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ (2/85)

یاد رکھو! تم میں سے جو ایسا کرے گا تو اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا کہ وہ اس دنیا میں بھی ذلیل و خوار ہوگا اور قیامت میں بھی شدید ترین عذاب میں مبتلا۔ خدا تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں"۔ یہ وہ نظام ہے جس میں مسلمانوں کی اجارہ داری ہوتی ہے جسے قرآن کریم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ:- وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُم بِاللَّهِ إِلَّا وَهُم مُّشْرِكُونَ (12/106) "وہ ایمان کا دعوے کرنے کے باوجود مشرک

رہتے ہیں۔

بہ وہ سیکولر نظام تھا جسے ہندوستان میں ہندو قائم کرنا چاہتا تھا اس کے برعکس، تحریک پاکستان کا مطالبہ دینی نظام کے قیام کے لئے جداگانہ مملکت کا تھا۔ ہمارے نیشنلسٹ علماء کرام وہاں ہندو کی تائید وحمایت کرتے تھے اور تحریک پاکستان کی مخالفت۔ یہی حالت دوسرے قومیت پرست مسلمان لیڈروں کی تھی۔ یعنی یہ سب سیکولر نظام کے داعی تھے۔ یہی وہ لیڈر ہیں، جو پاکستان میں بھی سیکولر نظام کے لئے کوشاں ہیں۔ شیخ مجیب الرحمن اسی نظام کا حامی تھا جس نے۔ لیے اس نے پاکستان سے علیحدگی اختیار کرلی۔ اب بقیہ حصہ ملک میں بھی ایسی سیاسی جماعتیں ہیں، جن کے منشور میں سیکولر نظام کے قیام کا مطالبہ شامل ہے۔ اور اس دور کے نیشنلسٹ علماء (جو یہاں آگئے ہیں) یا ان کے متبعین اور عقیدت مند ان کی تائید کرتے ہیں جو مذہب پرست بظاہر سیکولر نظام کے مخالف ہیں اور اقامت دین کی تحریک کے مدعی، یہاں تھیاکریسی کا نظام قائم کرنا چاہتے ہیں جس میں نظام حکومت مذہبی پیشوائیت کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ ما انزل اللہ کے مطابق قیام حکومت، ان میں سے کسی کا بھی مطالبہ یا نصب العین نہیں۔ جہاں تک مملکت پاکستان کا تعلق ہے، اس نے نظری اور آئینی طور پر تو اپنے دینی ہونے کا اعلان کر رکھا ہے۔ لیکن عملاً یہاں بھی ہنوز سیکولر نظام ہی رائج ہے۔ پاکستان تو ایک طرف، کتاب اللہ کی حکومت اس وقت دنیا میں کہیں بھی نہیں۔

مغرب ز تو بیگانہ، مشرق ہمہ افسانہ — برخیز کہ در عالم، نقش دگر انگیزی

۲۔ کچھ "چھٹی حس" کے بارے میں:

ایک صاحب پرویز صاحب کے نام اپنے طویل گرامی نامہ کے آخر میں لکھتے ہیں:۔

ہاں! مجھے آپ کے ان افکار کے متعلق شک ہے۔ جو تصوف کے بارے میں سامنے آئے ہیں کیونکہ موجودہ (PARA PSYCHOLOGY) اور قوتِ اشراق کے سائنٹفک مطالعہ سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ ذہن انسانی کو اللہ نے مادر لئے تو اہر مسر کی قوت سے نوازا ہے اور اس) چھٹی حس (یعنی) وجدان، روحانیت یا ما فوق الفطرت قوت سے انسانی ذہن محروم نہیں اور نہ کبھی رہا ہے اس سلسلہ میں آپ کی تحریر اور آپ کے قلم سے کچھ ... کا حاصل کرنا چاہتا ہوں۔

پرویز: میں اس "چھٹی حس" کا منکر نہیں۔ اور منکر ہو بھی کیسے سکتا ہوں جب میں نے اسے خود حاصل کرکے دیکھ لیا ہوا ہے۔ لیکن اس حس کا تعلق نہ "روحانیت" سے ہے، نہ کسی فوق الفطرت سرچشمہ سے چند قاعدے اور چند مشقیں ہیں جن سے انسان جب اپنی قوتِ فکر و خیال یا قوتِ ارادی کو نہایت شدت سے مرتکز (CONCENTRATE) کرلیتا ہے تو خود اس کی فکر ایک لطیف قوت کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اسی کا نام "چھٹی حس" ہے جسے سائیکولوجی میں وجدان (INTUITION) کہا جاتا ہے (خود برگساں۔ جو وجدان کا بہت بڑا حامی ہے۔ اسے ادراک ہی کی شکل کہہ کر پکارتا ہے) اس فکری قوت کے پیدا کرنے کے لئے نہ کسی عقیدہ کی پابندی ضروری ہے، نہ کفر

اور اسلام ہی کی تمیز۔ یہ ایک فنی ملکہ ہے جسے جو شخص چاہے (ان مشقوں کے ذریعے) پیدا کر سکتا ہے اس میں کوئی "فوق الفطرت" راز بھی نہیں۔ (جب آپ کہتے ہیں کہ اس کا "سائنٹفک طریق" سے مطالعہ کیا جا سکتا ہے تو اس کے "مافوق الفطرت" ہونے کی تردید آپ خود ہی کر دیتے ہیں۔ کسی "فوق الفطرت" عنصر کا مطالعہ سائنٹفک طریق سے نہیں کیا جا سکتا۔ سائنس کا دائرہ، فطرت تک محدود ہے۔ وہ اس سے باہر جا ہی نہیں سکتی)۔ بہرحال یہ "حس" فکرِ انسانی ہی کی بڑھی ہوئی شکل ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ یہ عام حواسِ خمسہ سے الگ یا بلند اور لطیف ہوتی ہے، اس لئے لوگ اسے "فوق الفطرت" یا "روحانی" قوت سمجھ لیتے ہیں۔ تصوف کی ریاضتوں اور مراقبوں سے بھی یہی قوت پیدا ہوتی ہے۔ میں نے اسے تصوف کی ریاضتوں اور یوگ کی مشقوں (دونوں کی رو) سے پیدا کر کے دیکھا ہوا ہے۔

تصوف کا عقیدہ کشف و الہام کا ہے جس کے معنی خدا سے براہِ راست علم حاصل ہونا ہے۔ یہ عقیدہ ختمِ نبوت کے منافی ہے۔ خدا سے براہِ راست علم "صرف حضرات انبیاء کرامؑ کو عطا ہوتا تھا جسے وحی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ سلسلہ حضور نبی اکرمؐ کی ذاتِ گرامی پر ختم ہو گیا۔ اب کسی کو خدا سے براہِ راست علم حاصل نہیں ہو سکتا اسی کو ختمِ نبوت کہتے ہیں۔

وحی کے اتباع سے انسان میں پاکیزگیٔ سیرت اور بلندیٔ کردار پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کا ارفع ترین اور مکمل ترین مقام وہ تھا جس پر نبی اکرمؐ فائز تھے اور جس کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِیْمٍ (۶۸/۴) "اے نبی! تو اخلاق کے عظیم مقام پر فائز ہے"۔ قرآن نے حضورؐ کی عظمت آپؐ کی اخلاقی بلندی کو قرار دیا ہے۔ یہی وہ سیرت کی پاکیزگی اور کردار کی بلندی تھی جسے حضورؐ نے مخالفین کے سامنے اپنے سچا ہونے کی شہادت کے طور پر پیش فرمایا تھا جب کہا تھا کہ:-

فَقَدْ لَبِثْتُ فِیْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۱۰/۱۶)

میں نے اس سے قبل، اپنی زندگی تمہارے اندر بسر کی ہے۔ کیا تم اس سے نہیں سمجھ سکتے کہ ایسی زندگی کسی جھوٹے انسان کی ہوتی ہے یا سچے کی۔

یہی پاکیزگیٔ سیرت و حسنِ کردار ہے۔ جو حضور نبی اکرمؐ کے اسوۂ حسنہ کے اتباع سے حاصل ہوتا ہے اور اس قسم کی سیرت و کردار کے حامل افراد پر مشتمل وہ جماعت (امتِ محمدیہؐ) ہوتی ہے جس کے ہاتھوں وہ نظام قائم ہوتا ہے جو اسلام کا مقصود اور دین کا منتہیٰ ہے۔ اسلام۔ کوئی "چھٹی حس" پیدا کرنے کے لئے نہیں آیا۔ وہ دنیا میں اس قسم کا نظام قائم کرنے کے لئے آیا تھا۔ جو ہر نوع غلامی کے لئے موت کا پیغام ہے۔

۳۔ تحقیق طلب مسائل

:- ذیل کا خط ملاحظہ فرمائیے۔ جو ان متعدد خطوط میں سے ایک ہے جو ہمیں اس موضوع پر موصول ہوتے ہیں۔

"آپ نے طلوعِ اسلام بابت اگست ۱۹۷۶ء کے لمعات میں جو کچھ لکھا ہے نظر بظاہر اس کا تعلق ادارہ تحقیقاتِ اسلامی سے ہے لیکن درحقیقت وہ نفسِ اسلام سے متعلق ہے۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے

کہ ہمارے ہاں ان مسائل کے متعلق بھی ابھی تک سائنٹفک انداز سے کوئی تحقیق نہیں ہوئی جو اسلام کی اصل و بنیاد ہیں مثلاً اس پر بھی کوئی تحقیق نہیں ہوئی کہ جو قرآن مجید ہمارے پاس ہے وہ بعینہٖ وہی ہے جسے رسول اللہ (صلعم) نے اُمت کو دیا تھا! یہی کچھ اُن دوسرے مسائل کی کیفیت ہے جن کا ذکر آپ نے لمعات میں کیا ہے۔ جس چیز کو ہمارے ہاں "تحقیق" کے نام سے پیش کیا جاتا ہے وہ اس سے زیادہ کیا ہوتی ہے کہ متقدمین نے جو کچھ اپنی کتابوں میں لکھ دیا ہے اسے یکجا کر دیا جائے۔ اسے تو تحقیق نہیں کہا جا سکتا۔ اس "تحقیق" کا نتیجہ وہ ہوتا ہے جسے آپ نے اختلافِ قرارت کے عنوان سے طلوعِ اسلام میں شائع کیا ہے۔ طلوعِ اسلام کا دم غنیمت ہے کہ وہ اس قسم کے مسائل قوم کے سامنے لاتا رہتا ہے

میں سمجھتا ہوں کہ ملک میں اور ادارے بھی جو کسی نہ کسی عنوان سے اسلامی کہلاتے ہیں (مثلاً ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، وغیرہ) اور حکومت کی امداد سے چلتے ہیں۔ انہیں بھی چاہیئے کہ ان موضوعات پر تحقیق کریں نیز ہماری یونیورسٹیوں کو چاہیئے کہ ایم اے (اسلامیات) کے طلباء سے ان پر تحقیق کرائیں۔ ڈاکٹریٹ کے لئے ان عنوانات پر تھیسس (THESIS) لکھوائیں (ریسرچ سکالرز سے کہیں کہ وہ ان موضوعات پر تحقیق کریں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر اس پروگرام پر عمل درآمد شروع ہو جائے تو تھوڑے سے عرصہ میں اس سلسلہ میں کافی ہو سکتا ہے۔

طلوعِ اسلام

ان تجاویز کے مفید اور مستحسن ہونے میں دو آراء ہو نہیں سکتیں اس لئے ہم اس خط کو بلا تبصرہ اپنی پوری تائید اور فکریہ کے ساتھ شائع کرتے ہیں۔ قارئین سے درخواست ہے کہ وہ اسلامی اداروں اور یونیورسٹیوں کو اس موضوع پر براہِ راست بھی لکھیں۔

۴۔ شیعہ حضرات اور تحریف فی القرآن

لاہور سے شیعہ مسلک کا ترجمان ماہنامہ معارف اسلام شائع ہوتا ہے۔ ہم نے ۲۹ جون ۱۹۷۴ء کو انہیں حسب ذیل خط لکھا:

محترمی مدیر معارف اسلام لاہور

"السلام علیکم۔ آپ نے اپنے موقر ماہنامہ 'معارف اسلام' کی جون ۱۹۷۴ء کی اشاعت کے صفحہ ۶ پر تحریر فرمایا ہے:۔

آپ مثلاً ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور نے بغیر ہماری طرف سے کسی تذکرہ و مطالبہ و مخالفت کے لکھ دیا کہ "شیعہ حضرات کا یہ عقیدہ ہے کہ جو قرآن مسلمانوں میں مروج ہے وہ محرف ہے" اب بتایئے کہ اس کو کیا سمجھا جائے یہ ہمیں بدنام کرنا نہیں تو اور کیا ہے:۔

مندرجہ بالا فقرہ، جو واوین میں درج ہے آپ نے اس مقالہ سے اخذ کیا ہے۔ جو طلوعِ اسلام کی اشاعت بابت ماہ مارچ ۱۹۷۴ء میں شائع ہوا ہے اور جس کا عنوان ہے "قرآن مجید میں تحریف۔ احمدی حضرات کی خصوصی توجہ کے لئے" ہمیں افسوس ہے کہ آپ نے بغیر یہ بتائے ہوئے کہ یہ فقرہ کس ضمن میں آیا ہے یہ لکھ دیا کہ اس سے مقصود آپ کو بدنام کرنا ہے حالانکہ اس مقالہ سے واضح ہے کہ اس سے مقصد

کسی کو بدنام کرنا نہیں۔ طلوع اسلام کا تو یہ مسلک ہی نہیں۔

۲۔ مذکورہ بالا مقالہ میں کہا یہ گیا ہے کہ سُنّی حضرات "اختلاف قراءت" میں عقیدہ رکھتے ہیں۔ اختلافِ قراءت سے مُراد یہ ہے کہ جب (ان کے عقیدہ کے مطابق) حضرت عثمانؓ نے قرآن مجید کا نسخہ جمع اور مرتب فرمایا تو مختلف صحابہؓ کے پاس قرآن مجید کے ایسے نسخے بھی تھے جن میں اکثر آیات اُن آیات سے مختلف تھیں جو صحیفۂ عثمانی میں درج تھیں۔ اس عقیدہ کی رُو سے قرآن کریم محرف ثابت ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد اس مقالہ میں لکھا ہے کہ "شیعہ حضرات کا یہ عقیدہ ہے کہ جو قرآن مسلمانوں میں مروج ہے وہ محرف ہے۔ اس میں اکثر و بیشتر آیات اس طرح نہیں لکھی گئیں جس طرح وہ نازل ہوئی تھیں ان میں تحریف کردی گئی ہے۔ اصلی آیات کا علم اُن کے آئمہ کرامؒ کو ہے۔ الکافی شیعہ حضرات کی سب سے زیادہ قابلِ اعتماد احادیث کی کتاب ہے۔ یہی اُن کے مسلک کا عروۃ الوثقیٰ ہے۔ اس میں متعدد آیات کے متعلق لکھا ہے کہ یہ آیت دراصل یوں نازل ہوئی تھی لیکن مروجہ قرآن میں اس طرح درج ہوئی"۔ اس کے بعد اس مقالہ میں الکافی کی روایات پیش کی گئی ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ یہ آیات دراصل یوں نازل ہوئی تھیں نہ کہ اس طرح جس طرح یہ مصحفِ عثمانی میں درج ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ آپ کو الکافی کی ان روایات کا علم ہوگا۔

۳۔ کافی کی اِن روایات کو درج کرنے کے بعد مقالے میں کہا گیا ہے کہ "سُنّی حضرات، شیعہ حضرات پر تو اعتراض کرتے ہیں کہ وہ قرآن کریم کو محرف مانتے ہیں لیکن خود اُن کی اپنی حالت یہ ہے کہ اختلاف قراءت کے عقیدہ کی رُو سے یہ تسلیم کرتے ہیں کہ آیات میں اختلاف حضرت عثمانؓ کے زمانے میں موجود تھا۔ فرمائیے اس باب میں ان میں اور شیعہ حضرات میں فرق کیا ہوا؟

۴۔ جو کچھ اوپر لکھا گیا ہے اُس سے واضح ہے کہ ہم نے جو لکھا تھا کہ شیعہ حضرات قرآن کو محرف کہتے ہیں تو اس سے مقصد انہیں بدنام کرنا نہیں ہے۔ اس کی بنیاد کافی کی وہ متعدد روایات ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ یہ آیت دراصل یوں نازل ہوئی تھی۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے۔ الکافی شیعہ حضرات کے سوادِ اعظم کے نزدیک احادیث کی مستند ترین کتاب ہے۔ اس بنا پر ہم نے جو لکھا ہے کہ شیعہ حضرات مروجہ قرآن کو محرف مانتے ہیں تو یہ بے بنیاد نہیں، اس کی بنیاد الکافی ہے۔

۵۔ آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ "اس عقیدہ کا شیعہ مسلکِ اسلامیہ میں کوئی وجود نہیں"۔ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ شیعہ حضرات میں ایسے مسالک بھی ہیں جو الکافی کو مستند نہیں مانتے اور قرآن کے محرف ہونے کے قائل نہیں۔ اور یہ کہ آپ حضرات کا یہی مسلک ہے۔ اگر ایسا ہی ہے تو یہ اُمر ہمارے لئے باعثِ مسرت ہے۔ اگر آپ اسکی توثیق فرما دیں تو ہم اسے بڑی خوشی سے طلوعِ اسلام میں شائع کر دیں گے۔ طلوعِ اسلام کا تعلق کسی فرقے سے نہیں۔ اسلئے یہ فرقہ وارانہ بحثوں میں کبھی نہیں الجھتا۔

۶۔ ہم شکر گزار ہونگے اگر آپ ہمارے اس عریضہ کو "معارف اسلام" میں شائع فرما دیں گے تاکہ آپ کے مذکورہ بالا فقرہ سے جس غلط فہمی کے پیدا ہونے کا امکان ہے اُس کا ازالہ ہو جائے۔

والسلام

دستخط [illegible] مدیر طلوعِ اسلام لاہور

اس خط کے جواب میں ان کا ایک طویل مراسلہ موصول ہوا جس میں متعلقہ موضوع کے علاوہ بہت سی غیر متعلق باتیں بھی تھیں۔ غیر متعلقہ امور سے صرفِ نظر کرتے ہوئے ہم نے ۲۶ جولائی کو ان کی خدمت میں حسبِ ذیل خط ارسال کیا:۔

امرِ متعلقہ اتنا ہی ہے کہ ہم نے الکافی کی روایات کی سند سے یہ لکھا تھا کہ شیعہ حضرات تحریف فی القرآن کے قائل ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ یہ الزام غلط ہے۔ بات ختم ہوئی۔ لہٰذا ہم طلوعِ اسلام میں آپ کے مکتوب گرامی کا وہ حصہ بخوشی شائع کرنے کے لئے تیار ہیں۔ جس کا تعلق اس مسئلہ سے ہے یعنی حسبِ ذیل حصہ:۔

"شیعہ مسلمانوں کے عقائد میں ہرگز ایسا نہیں ہے کہ قرآن پاک (معاذ اللہ) محرف ہے۔ شیعہ مسلمانوں کے اصول دین اور فروعِ دین میں اس عقیدہ کی طرف اشارہ تک بھی موجود نہیں۔ کتب عقائد جو موجود ہیں (ان میں) قرآن حکیم کے متعلق کہیں یہ عقیدہ موجود نہیں۔ کتاب الکافی حدیث معصومینؑ (یعنی محمدؐ و آلِ محمدؐ) ضرور ہے۔ ۔۔ ۔۔ لیکن شیعہ مسلمان اسلام کے دیگر فرقوں کی طرح اپنی کتب کو "صحاح" نہیں کہتے۔ وہ سوائے قرآن پاک کے اور کسی بھی کتاب کو کلی طور پر صحیح اور افراط و تفریط اور سہو سے مبرا تصور نہیں کرتے۔۔۔۔ (کتب روایات میں) نقل کردہ اقوال، معصومینؑ جو قرآن کے مطابق ہوں گے وہ درست ہوں گے اور انہیں ہی درست قول معصومؑ تصور کیا جائے گا جو خلافِ قرآن ہوگا وہ فرمودات معصومؑ میں سے نہ ہوگا۔۔۔۔ شیعہ اسلامی مسلک کے مطابق قرآن مجید کو جو بین الدفتین بائے بسم اللہ سے سین والناس تک موجود ہے وہ بالکل غیر محرف اور کمی بیشی سے مبرا ہے"

کتب روایات کے متعلق طلوعِ اسلام کا بھی یہی مسلک ہے۔ یعنی یہ کہ ان میں۔ جو روایات قرآن کے مطابق ہیں انہیں ارشادات رسول اللہ تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ جو قرآن مجید کے خلاف ہیں ان کے متعلق کہا جائے گا کہ وہ اقوال رسول اللہؐ نہیں ہیں۔

ضمناً، نہ پرویز صاحب اپنی فکر یا تحریر کو سہو و خطا سے مبرا قرار دیتے ہیں۔ اور نہ ہی ہم انہیں ایسا سمجھتے ہیں۔ سہو و خطا سے مبرا تو اس آسمان کے نیچے صرف خدا کی کتاب ہے۔

۲۔ آپ کی توثیق کے بعد ہم اس خط کو طلوعِ اسلام میں شائع کر دیں گے"۔

اس کے جواب میں انہوں نے یکم اگست کو لکھا کہ "آپ ہمارے خط میں سے۔ جو اقتباس مناسب سمجھیں شائع کر دیں"۔ اس کے مطابق مندرجہ بالا اقتباسات شائع کئے جا رہے ہیں۔ ہم اس بحث کو طول نہیں

PARKWAY-HOTEL
لاہور میں قیام کیلئے:
صاف ستھرے ہوادار کمرے، مناسب شرح کرایہ
نیز عمدہ لذیذ اور پسندیدہ کھانوں کیلئے
معیاری طعام گاہ
پارک وے ہوٹل
فون: (۵۷۲۵۹)
آپ کی تشریف آوری کا منتظر
منیجر پارک وے ہوٹل
نزد ریلوے اسٹیشن لاہور

پروفیسر رفیع اللہ شہاب میانوالی

رسمِ جہیز۔ ایک غیر شرعی اصطلاح

ایک سال سے کچھ زیادہ عرصے کی بات ہے کہ حکومتِ پنجاب نے رسمِ جہیز پر کچھ پابندیاں عائد کرنے کے لئے ایک مسودہ قانون تیار کیا تھا۔ موضوع کی مناسبت سے اخبارات میں بھی بحث چلی اور اہلِ علم کی محفلوں میں بھی اس پر گفتگو ہوئی۔ یہ علٰحدہ بات ہے کہ کسی نیشنل سنٹر میں اس پر مجلسِ مذاکرہ منعقد نہ ہوئی۔ اخبارات میں مختلف مضامین کا خلاصہ یہ تھا کہ موجودہ رسمِ جہیز نے ہمارے معاشرے میں طرح طرح کی ناخوشگواریاں پیدا کر رکھی ہیں۔ خصوصاً غریب والدین کے لئے تو اس نے ایک عذاب کی شکل اختیار کر رکھی ہے۔ کیونکہ جہیز کی استطاعت نہ رکھنے کی وجہ سے وہ اپنی جوان بیٹیوں کی شادیاں کرانے سے معذور ہیں اس لئے اس مصیبت سے بچنے کے لئے ہمیں سنتِ رسول اللہ پر عمل کرتے ہوئے نہایت سادہ جہیز کو رواج دینا چاہیئے۔

انہی دنوں اہلِ علم کی ایک محفل میں اس مسئلہ پر گفتگو ہو رہی تھی تو ہمارے استاذِ مکرم مولانا شاہ محمد جعفر پھلواروی صاحب نے ایک عجیب حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ بڑی حیرت کی بات ہے کہ ہمارے علماء جہیز کی ہندوانہ رسم کو سنتِ رسول اللہ قرار دے رہے ہیں حالانکہ سنتِ رسول اللہ تو کجا، سرے سے عربی زبان میں رسمِ جہیز کے لئے کوئی لفظ ہی نہیں اور نہ ہی دورِ رسالت بلکہ اس کے صدیوں بعد تک، اس رسم کا نشان تک نہیں ملتا۔ عربی زبان میں ایک لفظ جہیز ضرور ہے لیکن اس کا وہ مفہوم نہیں جو ہمارے ہاں مروج ہے۔ عربی میں اس کے معنی ہلکے تیز گھوڑے کے ہیں استاذِ مکرم کے اس لطیف نکتے سے راقم کے دل میں مزید تحقیق کا شوق پیدا ہوا جس کے لئے انہوں نے مزید رہنمائی فرمائی۔

جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ رسمِ جہیز سے مراد وہ ضروری اور غیر ضروری ساز و سامان ہے جو شادی کی تقریب پر والدین اپنی طرف سے لڑکی کو دیتے ہیں۔ اس ساز و سامان میں جہاں گھر کی ضروریات کا کچھ حصہ ہوتا ہے، وہاں زیادہ تر نام و نمود کی چیزوں کا پلڑا بھاری ہوتا ہے۔ اس رسمِ جہیز کی افادی حیثیت سے انکار نہیں کہ پرانے زمانے میں اگر خاوند کی مالی حالت کمزور ہوتی ہوگی تو نیا گھر بسانے کے لئے اس رسم کی رُو سے اس کی مدد کی جاتی ہوگی۔ رسموں کی ابتدا تو کسی نہ کسی افادی نقطۂ نظر سے ہوتی ہے لیکن مرورِ زمانہ سے وہ اپنی افادی حیثیت کھو کر الٹا معاشرے کے لئے باعثِ مصیبت بن جاتی ہیں۔ ایسا

یہی معاملہ رسمِ جہیز کے ساتھ ہوا۔ جہاں تک شریعتِ اسلامیہ کا تعلق ہے اس کی تعلیمات اس بارے میں بڑی واضح ہیں کہ شادی کے بعد بیوی کے اخراجات اور ضروریات کی ذمہ داری خاوند کے سر پر ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نہ ہی قرآن و حدیث اور نہ ہی فقہ کی سینکڑوں کتابوں میں رسمِ جہیز کا کوئی ذکر ہے اس کے برعکس قرآن مجید میں یہ واضح احکام ہیں کہ جن لوگوں میں شادی کے اخراجات برداشت کرنے کی استطاعت نہ ہو وہ اس سے باز رہیں اور ضبط سے کام لیں یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے انہیں غنی کر دے۔ (وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِينَ لَا يَجِدُونَ نِكَاحًا حَتَّىٰ يُغْنِيَهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ) (سورۃ النور۔ ۳۳) اور اس معاملے میں ہمارے فقہا نے یہاں تک سخت احکام دیئے ہیں کہ اگر شادی کے بعد کسی وقت خاوند، بیوی کے اخراجات برداشت کرنے کے قابل نہ رہے تو بیوی کو نکاح فسخ کرانے کا حق حاصل ہے۔ مختصر یہ کہ رسمِ جہیز کا اسلامی تعلیمات سے کوئی تعلق نہیں۔ ہمارے ملک میں یہ رسم ہندوؤں سے آئی تھی جو اپنی لڑکیوں کو ترکے میں کوئی حصہ نہیں دیتے تھے اور کوشش کرتے تھے کہ شادی کے موقع پر رسمِ جہیز کے ذریعے اس کی تلافی کر دیں۔ عجیب اتفاق ہے کہ اب ہندوؤں نے لڑکیوں کو وراثت میں حصہ دینے اور جہیز پر پابندی عائد کرنے کا قانون وضع کر لیا ہے اور ہم نے اسے سنتِ رسول اللہ قرار دے کر گلے کا ہار بنا رکھا ہے۔

رسمِ جہیز کو سنتِ رسول اللہ قرار دینے کی غلط فہمی مندرجہ ذیل حدیث سے پیدا ہوئی ہے:۔

جَهَّزَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاطِمَةَ فِي خَمِيلٍ وَقِرْبَةٍ وَوِسَادَةٍ حَشْوُهَا إِذْخِرٌ (سنن نسائی مطبوعہ کراچی جلد دوم صفحہ)

حضور صلعم نے حضرت فاطمۃ الزہراؓ کی شادی پر انہیں ایک چادر، ایک مشکیزہ اور ایک تکیہ جس میں اذخر گھاس بھری ہوئی تھی کا سامان مہیا کیا۔

یہاں لفظ جَهَّزَ سے یہ مفہوم لیا گیا ہے کہ حضور صلعم نے یہ چیزیں "جہیز" میں دی تھیں" حالانکہ عربی زبان میں جَهَّزَ کے معنی جہیز دینا نہیں بلکہ "تیار کرنا" ہیں عربی لغت میں مسافر، مجاہد، میت اور دلہن وغیرہ کو ان کے مناسب حال ساز و سامان مہیا کرنے کے لئے جَهَّزَ کا لفظ آتا ہے۔ قرآن مجید میں حضرت یوسف علیہ السلام کے ذکر میں ہے۔ فَلَمَّا جَهَّزَهُم بِجَهَازِهِمْ یعنی حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کا سامان تیار کر دیا یعنی انہیں اناج مہیا کر دیا۔ یہاں کوئی اہلِ علم یہ مفہوم نہیں لے سکتا کہ حضرت یوسف نے اپنے بھائیوں کو "جہیز" دیا۔

اب دیکھیے کہ حضور (صلعم) نے حضرت فاطمۃ الزہراؓ کی شادی کا یہ سامان کہاں سے مہیا فرمایا: اپنی جیب سے، جیسا کہ رسمِ جہیز میں والدین اپنی جیب سے دلہن کے لئے بہت سا ساز و سامان وغیرہ مہیا کرتے ہیں، یا اسلامی تعلیمات کی روشنی میں خاوند کے اخراجات سے جس پر شادی کے بعد اس کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے، اسے مہیا فرمایا۔ سیرت النبیؐ کی تمام کتابوں میں حضرت فاطمۃ الزہراؓ کی شادی کی تفصیلات ملتی ہیں اور یہ بھی کہ انہیں اس موقع پر جو ساز و سامان دیا گیا وہ کہاں سے مہیا کیا گیا تھا۔ مثلاً شرح المواہب اللدنیہ میں ذکر تزویج علی بفاطمۃ رضی اللہ عنہما کے عنوان سے

تحت حضرت علیؓ کی زبانی یہ واقعہ ان الفاظ میں درج ہے :-

(ترجمہ) "یہاں تک کہ میں (یعنی حضرت علیؓ) نے حضور صلعم کی خدمت میں حاضر ہو کر پوچھا کہ کیا حضورؐ حضرت فاطمہؓ کا مجھ سے نکاح کرنا پسند فرمائیں گے؟ حضور صلعم نے دریافت فرمایا کہ تمہارے پاس کچھ مال ہے؟ میں نے عرض کیا میرا گھوڑا ہے یا زرہ۔ فرمایا گھوڑے کی تو بہرحال تمہیں ضرورت رہے گی۔ رہی زرہ تو اسے فروخت کر دو چنانچہ میں نے زرہ عثمانؓ بن عفان کے ہاتھ چار سو اسی درہم میں فروخت کر دی۔ اس کے بعد حضرت عثمانؓ نے وہ زرہ بھی واپس کر دی۔ حضرت علیؓ وہ زرہ اور رقم لے کر حضورؐ کی خدمت میں آئے۔ حضور صلعم نے حضرت عثمانؓ کے حق میں دعائے خیر فرمائی جیسا کہ بعض روایات میں ہے۔ پھر میں (یعنی حضرت علیؓ) رقم لے کر آیا اور اسے حضورؐ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ حضور صلعم نے اس میں سے ایک مٹھی بھر کر فرمایا کہ بلالؓ! اس رقم کی خوشبو خرید کر ہمارے پاس لے آؤ۔ ابن ابی خثیمہ نے حضرت علیؓ کی زبانی جو روایت بیان کی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں کہ حضور صلعم نے حکم فرمایا کہ ان چار سو اسی درہموں کی تہائی خوشبو میں صرف کی جائے۔ پھر حضور صلعم نے لوگوں سے فرمایا کہ حضرت فاطمہؓ کے لئے سامان مہیا کریں۔ چنانچہ ان کے لئے ایک بُنی ہوئی چارپائی اور ایک چرمی تکیہ جس میں کھجور کی چھال بھری تھی تیار کئے گئے"۔

اس سلسلے میں شیعہ فرقے کے اہلِ علم کی ایک تحقیق ملاحظہ ہو کہ جس سے مذکورہ بالا روایت کی نہ صرف تائید ہوتی ہے بلکہ کسی حد تک اس کی تشریح بھی۔ مشہور شیعہ مؤرخ، میرخواند محمد بن خاوند شاہ بن محمود ہروی اپنی مشہور فارسی تصنیف روضۃ الصفا فی سیرۃ الانبیاء والملوک والخلفاء میں فرماتے ہیں :-

(ترجمہ) جب حضرت علیؓ نے حضرت فاطمۃ الزہراؓ سے شادی کی خواہش ظاہر کی تو حضور صلعم نے دریافت فرمایا کہ ان کے مہر کے لئے کیا کرو گے؟ عرض کیا کہ میرے پاس تو کچھ نہیں۔ حضور صلعم نے فرمایا کہ تمہاری وہ حطمی زرہ کہاں ہے؟ عرض کیا وہ تو موجود ہے، حضورؐ نے فرمایا کہ بس اسی کو مہر قرار دے دو۔ کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے وہ زرہ چار سو اسی درہم میں حضرت عثمانؓ کے ہاتھ فروخت کی وہ زرہ ایسی کشادہ اور سخت تھی کہ اس پر تلوار بھی کوئی اثر نہ کر سکتی تھی۔ حضرت عثمانؓ نے وہ زرہ خریدنے کے بعد حضرت علیؓ کو واپس کر دی۔ علیؓ مرتضیٰ وہ زرہ اور اس کی قیمت جو چار سو اسی درہم تھی لے کر محمد مصطفےٰؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حضور صلعم نے حضرت عثمانؓ کے حق میں دعا دی۔ ایک روایت یہ ہے کہ حضور صلعم نے اس رقم کے دو حصے تو خوشبو میں صرف فرمائے اور چار حصے دوسرے چار مصارف میں۔ مثلاً دو دھاری دار چادریں، دو چاندی کے بازوبند، ایک بستر کا لحاف اور اسی کا ایک تکیہ۔ بعض مؤرخین دو تکیے بتاتے ہیں اور بعض دیگر چیزیں، جن کی ضرورت تھی یہ سب کچھ اسی مہر کی رقم سے حضورؐ نے تیار فرمایا۔ (از آں زر مرتب ساختند) (جلد دوم مطبوعہ نولکشور صفحہ ...)

ان تفصیلات سے واضح ہے کہ حضورؐ نے حضرت فاطمہؓ کی شادی کا مذکورہ بالا سامان اپنی جیب سے

مہیا نہیں فرمایا تھا بلکہ مہر کی اس رقم سے جو حضرت علیؓ نے شادی سے پہلے پیش کر دی تھی۔ حضرت فاطمہؓ حضور صلعم کا لختِ جگر گوشہ تھیں اور اگر آپؐ چاہتے تو آپؐ اپنی پیاری بیٹی کو کافی جہیز دے سکتے تھے۔ لیکن آپؐ نے ایسا نہیں کیا۔

سیرت النبیؐ کی کتابوں میں حضرت فاطمہؓ کے مذکورہ بالا "جہیز" کی تو کچھ تفصیلات مل جاتی ہیں لیکن آپ کی دوسری صاحبزادیوں کے سلسلے میں اس ساز و سامان کا بھی ذکر نہیں اور نہ ہی اس چیز کا ذکر ملتا ہے کہ ازواجِ مطہراتؓ کوئی جہیز اپنے ساتھ لائیں۔ اس سے یہ حقیقت خود بخود کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ حضور صلعم نے حضرت فاطمہؓ کے سلسلے میں جو سامان مہیا کیا وہ فوری ضرورت کے لئے تھا اور دوسری صاحبزادیوںؓ کو اور ازواجِ مطہراتؓ کو اس سامان کی اس لئے ضرورت نہ تھی کہ جن گھروں میں انہوں نے جانا تھا وہاں وہ سامان پہلے سے موجود تھا۔ حضرت فاطمہؓ کی فوری ضرورت یہ تھی کہ حضرت علیؓ کا اپنا کوئی مکان نہ تھا۔ شادی کے وقت ایک صحابی حضرت حارثہؓ بن نعمان انصاری نے اپنا ایک گھر انہیں پیش کیا۔ اس خالی گھر کو اثاث البیت کی ضرورت تھی جسے حضور صلعم نے حضرت فاطمہؓ کے مہر کی اس رقم سے جسے حضرت علیؓ نے شادی سے پہلے ادا کر دیا تھا۔ مہیا فرمایا۔ اور اگر دوسری صاحبزادیوںؓ کے خاوندوں کی طرح حضرت علیؓ کا گھر بھی پہلے سے موجود ہوتا، تو حضور صلعم کو یہ سامان بھی مہیا نہ کرنا پڑتا۔

یہ ان ہی تعلیمات کا اثر تھا کہ عرب معاشرے میں صدیوں تک رسمِ جہیز کا کوئی رواج نہیں ملتا۔ اب عرب اقوام کافی دولت مند ہو چکی ہیں اور دنیا کے دوسرے ممالک سے یہ رسم ان ممالک میں بھی پہنچ گئی ہے۔ لیکن چونکہ ان کے ہاں اس رسم کا سرے سے کوئی رواج ہی نہیں رہا اس لئے ان کو رسمِ جہیز کے لئے کوئی مناسب لفظ بھی نہ مل سکا۔ اب اس مقصد کے لئے انہوں نے "باکنہ" کا لفظ منتخب کیا ہے جس کے قدیم لغوی معانی تو "جدا کرنے والی" ہے لیکن اب اس سے مراد وہ ساز و سامان لیا جانے لگا ہے جو رخصتی کے وقت والدین اپنی جیب سے دلہن کے ساتھ کر دیتے ہیں اور جسے ہم رسمِ جہیز کا نام دیتے ہیں۔

ہماری ان گذارشات سے کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ ہم لڑکیوں کو کچھ دینے کے خلاف ہیں۔ حاشا و کلا۔ ہم کہنا صرف یہ چاہتے ہیں کہ اس بارے میں جب اسلام کا نام لیا جاتا ہے تو اسلامی تعلیمات پر پوری طرح عمل کیا جائے۔ لڑکیوں کو جائیداد میں سے ان کا پورا حق ملنا چاہیئے، لیکن شادی کے بعد چونکہ بیوی کی ضروریات اور حاجات کی ذمہ داری خاوند کے ذمے ہوتی ہے اس لئے خاوند کو ہر صورت میں اس ذمہ داری کو پورا کرنا چاہیئے اگر کسی وقت والدین اپنی بیٹی کی مدد کرنا چاہیں تو وہ شوق سے ایسا کریں لیکن اسے جہیز کا نام دے کر اسے لازمہ شادی) قرار نہ دیں اور نہ ہی اس کا رشتہ سنت رسول اللہ سے جا ملائیں۔ چند والدین کے لئے تو ایسا کرنا بے شک آسان ہے۔ لیکن معاشرے کی اکثریت کے لئے یہ ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے یہی وجہ ہے کہ اس مضرتِ رساں رسم کی وجہ سے کئی گھرانے برباد ہو چکے ہیں اور حیرت اندر حیرت یہ کہ حضور صلعم نے تو اپنی جگر گوشہ حضرت فاطمہؓ کی شادی کا ساز و سامان ان کے مہر کی اس رقم سے تیار کروایا کہ جو حضرت علیؓ نے پیشگی ادا کر دی تھی اور ہم اس ہندوؤں سے مستعار لی ہوئی رسم کو سنت رسول اللہ کا نام دیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سلسلے میں اگر سنت

رسولؐ اللہ پر عمل کیا جاتا تو رسمِ جہیز کے ساتھ متعدد دوسری خرابیاں بھی جنم نہ لیتیں۔

رسم جہیز پر پابندیاں لگانے کے لئے حکومت نے جو مسودہ قانون مرتب کیا تھا۔ معلوم نہیں وہ کس مرحلے میں ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ اس بارے میں آخری فیصلہ کرتے وقت ہماری اِن گذارشات کو بھی سامنے رکھا جائے تاکہ ہمارے معاشرے سے اس ہندوانہ رسم کو جلد از جلد ختم کر کے بیچاری معصوم لڑکیوں کے غریب والدین کو اس خود اور عذاب سے بچایا جا سکے۔

محترم پرویز صاحب کا درسِ قرآنِ کریم

لاہور میں

ہر اتوار - صبح ۸ بجے

بمقام

۲۵/ بی گلبرگ ۲

لاہور

ٹیلیفون ۸۰۸۰۰

لائل پور میں

بروز جمعہ (بذریعہ ٹیپ) ۵½ بجے سہ پہر

بمقام: دفتر بزم طلوع اسلام

۶۵ کوتوالی روڈ متصل حیات سرجری کلینک) لائل پور

ٹیلیفون ۲۲۹۴

مُلتان میں

بروز جمعہ (بذریعہ ٹیپ) بعد نماز مغرب

بمقام: دفتر شاہ سنز

بیرون پاک گیٹ - ملتان

ٹیلیفون ۲۰۷۱

سیالکوٹ میں

ہر اتوار - صبح ۸ بجے (بذریعہ ٹیپ)

مکان نمبر ۸۹/۲ چوہدری محمد دین ولد کمال دین

نمائندہ طلوع اسلام

موضع و ڈاکخانہ گوہر پور (محلہ مغربی) سیالکوٹ

کراچی میں

ہر اتوار صبح ۹½ بجے (بذریعہ ٹیپ)

بمقام: دفتر طلوع اسلام

دار القائد B/۱-۲۰

بس سٹاپ ۷ - ناظم آباد III کراچی ۱۸

ٹیلیفون ۶۱۰۶۸

کوئٹہ میں

ہر اتوار - ۱۰½ بجے دوپہر (بذریعہ ٹیپ)

بمقام: ۲۸ گوردت سنگھ روڈ

ٹیلیفون [illegible] کوئٹہ

راولپنڈی میں

ہر جمعہ: ۵ بجے سہ پہر (بذریعہ ٹیپ)

بمقام: جی ۱۶۶ لیاقت روڈ

راولپنڈی

واہ میں

ہر جمعہ - بعد نماز جمعہ (بذریعہ ٹیپ)

بمقام: ۱۵ جہلم روڈ

واہ (WAH)

ادارہ طلوع اسلام کی مطبوعات کی قیمتیں

نوٹ: ان قیمتوں میں پیکنگ اور ڈاک کا خرچ شامل نہیں۔

نام کتاب	قیمت	نام کتاب	قیمت
مفہوم القرآن (پارہ اول)	۳/۵۰ روپے	برق طور	۱۵/-
〃 〃 (پارہ ۲ تا پارہ ۲۷)	۲/۲۵ روپے فی پارہ	کتاب التقدیر	۱۵/-
〃 〃 (پارہ ۲۸ تا ۲۹ یکجا)	۶/۵۰ 〃 〃	شاہکار رسالت	۳۵/-
〃 〃 (پارہ ۳۰)	۴/۵۰ 〃 〃	قائد اعظم کے تصور کا پاکستان	۱۲/-
مفہوم القرآن (جلد اول)	۳۰/- روپے	معراج انسانیت	۲۵/-
〃 〃 (جلد دوم)	۳۰/- 〃	سلسبیل	۱۰/-
〃 〃 (جلد سوم)	۳۵/- 〃	فردوس گم گشتہ	۱۰/-
〃 〃 مکمل سیٹ	۹۵/- 〃	اسلامی معاشرت	۴/-
لغات القرآن (جلد اول)	۲۰/- روپے	اسباب زوال امت	۲/-
〃 〃 (دوم)	۲۰/- 〃	جہاد	۲/۵۰
〃 〃 سوم	۲۰/- 〃	قرآنی قوانین واقتدار	۴/-
〃 〃 چہارم	۲۰/- 〃	قرآنی فیصلے (جلد اول)	۵/-
〃 〃 مکمل سیٹ	۸۰/- 〃	قرآنی فیصلے (جلد دوم)	۵/-
اسلام کیا ہے؟ (اعلیٰ)	۱۰/- روپے	قرآنی فیصلے (جلد سوم)	۵/-
〃 〃 〃 ؟ سستا ایڈیشن	۶/- 〃	〃 〃 مکمل سیٹ	۱۵/-
انسان نے کیا سوچا؟	۱۵/- 〃		
من و یزداں	۲۵/- 〃		
جوئے نور	۱۵/- 〃		
ابلیس و آدم	۱۵/- 〃		

نام کتاب	قیمت
سلیم کے نام (جلد اوّل)	-/۱۰
" " (جلد دوم)	-/۱۰
" " (جلد سوم)	-/۱۰
" مکمل سیٹ	-/۳۰
طاہرہ کے نام	-/۶
عربی خود سیکھیے (چوتھا ایڈیشن)	-/۶
پاکستان کا معمارِ اوّل	۳/۵۰
الفتنۃ الکبریٰ (طٰہٰ حسین)	-/۸
فجر الاسلام (جلد اوّل)	-/۵
" (جلد دوم)	-/۵
اسلام پر کیا گزری؟ (از علامہ امین مصری)	-/۸
منزل بہ منزل	-/۸
ISLAM A CHALLENGE TO RELIGION (پیپر بیک)	(مجلد) -/۳۰ روپے -/۲۰ روپے
قتلِ مرتد	—/۲ "

نام کتاب	قیمت
انسانیت کا آخری سہارا	-/۱ روپیہ
عالمگیر افسانے	-/۱ "
پرنسپلز آف لا، میکنگ اِن اسلام (انگریزی)	۲/۵۰ روپے
جمع القرآن (علامہ تمنا عمادی مرحوم)	۲/۵۰ "
تاریخ الامت (جلد اوّل)	-/۳ "
" " (جلد دوم)	-/۳ "
" " (جلد سوم)	-/۳ "
" " (جلد چہارم)	-/۲ "
" " (جلد پنجم)	-/۴ "
" " (جلد ششم)	-/۴ "
" " (جلد ہفتم)	-/۳ "
" " (جلد ہشتم)	-/۳ "
(از علامہ اسلم جیراجپوری مرحوم)	
" مکمل سیٹ	-/۲۵ "
QURAN AND PHENOMENA OF NATURE	
(از پروفیسر ڈاکٹر سید عبدالودود)	-/۳۰ "

ملنے کا پتہ

مکتبۂ دین و دانش، چوک اُردو بازار لاہور

ادارہ طلوعِ اسلام - ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور

مجلسِ مذاکرہ نومبر ۷۱ء دسمبر

موضوع: نہ ہو نومید ------

نجمہ منور: بزرگانِ کرام سلام و رحمت

بابا جی نے سیرتِ حضرت عمرؓ کے متعلق اس کنونشن میں جو اپنا شاہکار پیش کیا ہے، اس میں ایک واقعہ میرے لئے بڑا سبق آموز ہے۔ حضرت عمرؓ جب کوئی چیز اُمہات المومنین میں تقسیم کرتے تو حضرت حفصہؓ جو اُن کی بیٹی تھیں، کا حصہ سب سے آخر میں لگاتے۔ اس سے انہیں دوسروں کے مقابلے میں کم ملتا۔

حضرت حفصہؓ کو یقیناً اس کا احساس ہوتا ہوگا کہ ہم نے سمجھا تھا کہ بابا امیر المومنین ہو گئے ہیں تو ہمیں کچھ زیادہ ملا کرے گا لیکن یہاں معاملہ اس کے برعکس ہو گیا۔ ہم خسارے میں رہ گئے۔

حضرت حفصہؓ کے دل میں یہ خیال ابھرا ہو یا نہ، ہم دونوں بہنوں کو تو یہ شکایت ہمیشہ رہی ہے کہ بابا جی مذاکرہ میں ہماری باری سب سے آخر میں رکھتے ہیں۔ اس سے ایک تو ہمارے حصے میں بچا کچا وقت آتا ہے اور دوسرے ہماری باری اس وقت آتی ہے جب کہنے کی باتیں سب کہی جا چکتی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود بابا جی کی بیٹیاں ہونے کی جو سعادت ہمیں حاصل ہے وہ اس کمی کو پورا کر دیتی ہے۔ اب آیئے مذاکرہ کے موضوع کی طرف!

گزشتہ مارچ اپریل کی بات ہے، میں بھی اپنے کروڑوں ہم وطنوں کی طرح ملک کے حالات سے متاثر ہو کر اکثر افسردہ خاطر رہتی تھی۔ لیکن میرے مشاہدہ میں ایک ایسی بات آئی جس نے میری سوچ کا رُخ بدل دیا اور اس کے بعد مجھ پر کبھی مایوسی نہیں چھائی۔ وہ زمانہ چڑیوں کے گھونسلے بنانے کا ہوتا ہے میں نے دیکھا کہ ایک چڑیا اور چڑا ایک ایک تنکا اٹھا کر لاتے اور میرے کمرے کے روشندان میں جمع کرتے جاتے۔ ایک تو اُن کی دن بھر کی اُڑان پھران اور چیں چیں۔ پھر اس پر یہ خیال کہ جب اس گھونسلے میں ان کے بچے پیدا ہوں گے تو مہینوں تک اُن کی چوں چوں رہے گی جس سے نیند اُڑ جایا کرے گی۔ یہ سوچ کر میں نے اُن کے جمع کردہ تنکے باہر پھینک دیئے۔ میں نے دوسری صبح دیکھا کہ انہیں اس کا کچھ بھی ملال نہیں ہوا کہ اُن کی محنت تار کا ماحصل اُن کی متاعِ حیات، اُن کے مستقبل کا سرمایہ لٹ گیا ہے۔ اُن کے بچوں کا ٹھکانہ برباد ہو گیا ہے۔ اُنہوں نے اُسی جذب و انہماک سے پھر آشیاں سازی شروع کر دی اور شام تک کافی تنکے پھر جمع کر دیئے اور میں نے اُن تنکوں کو اٹھا کر پھر باہر پھینک دیا اور انہوں نے دوسری بار پھر تنکے لانے شروع کر دیئے۔ میری اور اُن کی یہ کشمکش دنوں اور ہفتوں تک جاری رہی۔ ہر شام اُن کا کاشانہ اُجڑتا لیکن دوسری صبح وہ پھر تازہ دم ہو کر از سرِ نو تعمیرِ آشیاں کے لئے مصروفِ سعی و کاوش ہو جاتے۔ انہوں نے بار بار کی ناکامیوں کے باوجود نہ حوصلہ ہارا، نہ ہمت چھوڑی۔ اُن کے عزمِ راسخ اور استقامت نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں اُن کے مقصد میں حائل نہ ہوں۔ چنانچہ انہوں نے گھونسلہ بنایا۔ اس میں انڈے دیئے اور ان سے حیاتِ نو کی نمود ہوئی۔ اپنے بچوں کی چیں چیں سے وہ جوڑا اس قدر پُرمسرت تھا کہ اُن کی چہچہاہٹ

سے سارا کمرہ گونج اُٹھتا اور مجھے ایسا لگتا جیسے وہ میرا منہ چڑا رہے ہوں کہ تم نے دیکھا ہم اپنے مقصد میں کس قدر کامیاب ہوئے ہیں۔ اس کے بعد وہ چڑیا اور چڑا بھی اُڑ گئے اور اُن کے بچے بھی لیکن میرے لئے اپنے پیچھے ایک ایسا نشانِ عبرت چھوڑ گئے جس نے میری سوچ کا رُخ موڑ دیا میری نگاہوں کا زاویہ بدل دیا۔ مَیں نے سوچنا شروع کیا کہ وہ کیا چیز تھی جس نے اُن چھوٹے چھوٹے پرندوں کو اس سعیِ مسلسل اور عملِ پیہم کا پیکر بنا دیا تھا۔ اس سے میرے سامنے حقیقتوں کے دروازے کھلتے چلے گئے۔

پہلی بات تو یہ سمجھ میں آئی کہ اُن کے دل میں افزائشِ نسل کے ذریعے اپنی زندگی کو دوام بخشنے کی آرزو اس قدر شدید تھی کہ وہ انہیں کسی پہلو چین سے نہیں بیٹھنے دیتی تھی۔ آشیاں سازی اس مقصد کے حصول کے پروگرام کی پہلی کڑی تھی۔ اس کے بعد اُنہیں اپنے اس پروگرام کے صحیح اور نتیجہ خیز ہونے پر ایسا یقین محکم تھا کہ شام کی خانہ ویرانی کے بعد انہوں نے ایک سیکنڈ کے لئے بھی یہ نہیں سوچا کہ اس طریقِ کار کو چھوڑ کر کوئی دوسرا پروگرام اختیار کر لیا جائے۔ اُنہیں یقین تھا کہ منزل تک پہنچنے کا وہی راستہ صحیح ہے۔ وہی صراطِ مستقیم ہے۔ اس لئے وہ ہر بار کی ناکامی کے بعد پھر اُسی راستے پر گامزن ہو جاتے تھے۔ یہ تو ہو سکتا تھا کہ وہ میری اس سرتا سر خود غرضانہ روش سے تنگ آ کر جو اپنی نیند کی خاطر دوسروں کے گھر اجاڑنے میں کوئی باک نہ سمجھے۔ میرا کمرہ چھوڑ کر کسی اور مقام کو اپنی آماجگاہ بنا لیتے۔ لیکن یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ اپنی تکمیلِ آرزو کے خیال کو چھوڑ دیں یا اس کے لئے کوئی اور راستہ اختیار کر لیں۔ اُن کے دل میں آرزو بیدار تھی اور منزلِ متعین اور اس منزل تک پہنچنے کے راستے کے صحیح ہونے پر یقین محکم۔ یہی چیزیں تھیں جو اُن کے عملِ پیہم کی محرک بن رہی تھیں اور نت نئی رکاوٹوں کے باوجود نہ اُن کے حوصلے پست ہونے دیتی تھیں نہ ہمتیں پر شکستہ۔ وہ جانتے ہی نہیں تھے کہ مایوسی کسے کہتے ہیں اور نا اُمیدی کیا ہوتی ہے۔ یہ ننھے ننھے پرندوں کی حالت ہے اور اس کے بعد جب میں انسان پر نگاہ ڈالتی ہوں جو اشرف المخلوقات ہونے کا مدعی ہے تو یہاں کیفیت ہی کچھ اور نظر آتی ہے۔ وہ ہر شام گھر اجڑنے کے باوجود کبھی مایوس نہیں ہوتے لیکن اس کی حالت یہ ہے کہ زندگی میں ایک ناکامی اس کی زندہ بستیوں کو قبرستانوں میں تبدیل کر دیتی ہے۔ اس پر زندگی کے تمام روشن پہلو تاریک ہو جاتے ہیں اس پر ابدی مایوسی چھا جاتی ہے اور یہ اس وقت ہوتا ہے جب دلوں میں تابندہ آرزوؤں کے چراغ گل ہو جاتے ہیں جب نشانِ منزل بننے والے دیئے بجھ جاتے ہیں۔ اور اس طرح انسان حیوانات سے بھی زیادہ پست سطح پر گر جاتا ہے۔ اُس وقت دُنیا بھر کی چڑیاں اور چڑے اس کا منہ چڑانے لگ جاتے ہیں۔

لہٰذا بزرگانِ من! اگر آپ اپنی مایوسیوں میں ڈوبی ہوئی قوم کو زندوں کی دُنیا میں واپس لانا چاہتے ہیں تو اُن کے سامنے زندگی کا بلند نصب العین رکھیے جس کے حصول کے لئے اُن کے دل میں تڑپ پیدا ہو جائے۔ یہ کچھ ہنگامہ آرائیوں اور فساد انگیزیوں سے نہیں ہو گا۔ فکری انقلاب سے ہو سکے گا۔

فطرت نے اس انقلاب کا جذبہ جانوروں کے اندر از خود رکھ دیا ہے۔ انسانوں کے اندر اسے صحیح تعلیم و تربیت سے پیدا کرنا ہوتا ہے اس کے سوا قوم کی نگاہوں کے سامنے اُمید کی شمعیں روشن کرنے کا کوئی طریق نہیں۔

گوگی (ننھا بچہ)

میرے بزرگو! میری ایک نقرے کی تقریر غور سے سُنیئے۔
آسمان کی آنکھ نے آج تک وہ رات نہیں دیکھی جس کے بعد صبح نہ ہوئی ہو۔ اس لئے نہ ہو نو اُمید۔

رانی (ننھی بچی)

میرے بزرگو۔! میرے بھائی کی طرح میری بھی ایک نقرے کی تقریر یہ ہے اور وہ یہ کہ:
آج تک دنیا میں کوئی ایسا باغ نہیں دیکھا گیا جس میں خزاں کے بعد بہار نہ آتی ہو اس لئے نہ ہو نا اُمید۔

سلمیٰ پرویز

میرے بزرگو! اپنی جانی پہچانی بیٹی کا سلام لو۔
میری بہن نے کہا ہے کہ ہماری باری اُس وقت آتی ہے جب کہنے والے سب کچھ کہہ چکتے ہیں لیکن مجھے اطمینان ہے کہ:

کہہ گئے اُن سے لاکھ افسانے　　پھر بھی کہنے کی بات باقی ہے

اور وہ کہنے کی بات یہ ہے کہ اصلی بات یہ نہیں کہ حالات مایوس کن ہوتے ہیں اس لئے ہم مایوس ہو جاتے ہیں۔ اصلی بات یہ ہے کہ ہم مایوس ہوتے ہیں اس لئے ہمیں ہر چیز پر مایوسی چھائی ہوئی نظر آتی ہے
ناصر کاظمی نے پوچھا تھا کہ:

دل تو میرا اُداس ہے ناصر　　شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے

اس کا جواب یہ تھا کہ شہر اس لئے سائیں سائیں کرتا تھا کہ آپ کا دل اُداس تھا۔ خارجی حالات بجائے خویش نہ مسرت خیز ہوتے ہیں، نہ غم آلود۔ ہم جس نگاہ سے اُنہیں دیکھیں، وہ ویسے ہی بن جاتے ہیں۔

میں اب سمجھا کہ دنیا کچھ نہیں دنیا میرا دل ہے　　بدل جانے سے اسکے رنگ ہر اک چیز کا بدلا

اور ہماری حالت یہ ہے کہ صدیوں سے ہمارے ساتھ یہ سازش ہو رہی ہے کہ ہمارے دل، غمِ دائم سے لذت لینے کے خوگر ہو چکے ہیں۔ ہمارا مزاج نوحہ گری بن گیا ہے۔ ہمارے ہاں بہترین شعر وہ نہیں جسے سُن کر زبان سے واہ نکلے۔ بہترین شعر وہ ہے جس پر دل سے بے ساختہ آہ نکلے ہماری بہترین موسیقی وہ نہیں کہ جس سے عروقِ مُردہ میں خونِ زندگی دوڑنے لگے۔ بہترین موسیقی وہ ہے جس سے رگِ حیات میں دوڑنے والا لہو منجمد ہو جائے۔ ہمیں میر کے نشتروں میں جو لذت ملتی ہے وہ اقبالؒ کی حدی خوانی میں نہیں ملتی ہمارے محبوب ترین موسیقار وہ ہیں، جن کی آواز میں سوز ہے جن کی

لے میں درد ہو۔ ہمارا سب سے زیادہ نامور شاعر (غالب) ہمیں فلسفۂ زندگی یہ سمجھا گیا ہے کہ:۔

قیدِ حیات و بندِ غم ، اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی ، غم سے نجات پائے کیوں

اور جب موت سے پہلے غم سے نجات پانے کا اِمکان ہی نہیں تو پھر اس کا سوال ہی نہیں کہ حالات اشک آور ہیں یا تبسم خیز۔ ہمیں تو ہر حال میں رونا ہے۔ سُنیئے کہ آپ کا نوحہ گر شاعر کیا کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

جی چاہتا ہے اب تو یہی میرے ہم نشیں
آئے مجھے ہنسی بھی تو میں رو دیا کروں

اُسے اِس سے غرض نہیں کہ اِس رونے کا سبب کیا ہے؟ اس کی تو کیفیت یہ ہے کہ:۔

ہے کوئی بات آج ہونے کو

پوچھا کہ صاحب! آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ آج کوئی بات ہونے کو ہے۔ کہا اس لئے کہ:

جی بہت چاہتا ہے رونے کو

اِس سے بھی آگے بڑھیے تو کہہ دیا کہ

؎ دل کو راحت سی ہوتی ہے محسوس
سامنا ہے کسی مصیبت کا

اِن کی ساری عمر اِس حالت میں گذر جاتی ہے کہ:

؎ بے قرار رہتا ہوں، اور کچھ نہیں معلوم
دل میں اِک تمنا ہے یہ خبر نہیں کیا ہے؟

جب انہیں خود ہی معلوم نہیں تو دوسروں کو کیا بتائیں گے؟ اس لئے انہوں نے پہلے ہی کہہ دیا کہ:

مت پوچھ کہ کیا مانگ کے روتے ہیں خدا سے
یوں سمجھو ہوا خاتمہ آج اپنی دعا کا

فطرت حالات میں تبدیلی کرتی رہتی ہے اس کے ہاں ہر خزاں کے بعد بہار آتی ہے وہ بہار جس سے کائنات کے گوشے گوشے میں نئی زندگی کی نمود ہوتی ہے۔ شجرِ حیات کی ہر شاخ سے ولولہ خوابیدہ انگڑائیاں لے کر اٹھتا ہے۔ پورے کا پورا صحنِ چمن کائنات، دامنِ باغبان و کفِ گلفروش نظر آتا ہے۔ ہمارے شاعر کو اس نغمۂ شادی میں بھی نوحۂ غم سنائی دیتا ہے اور نہایت ناصحانہ انداز میں کہتا ہے کہ

نہ سمجھو تم اسے شورِ بہاراں
خزاں پتّوں میں چھپ کر رو رہی ہے

صدیوں کی اس نوحہ گری سے اِن کی حالت یہ ہو چکی ہے کہ سر زانوں پر دھرا ہے اور سسکیاں لے لے کر کہہ رہے ہیں کہ:

عالم کی فضا پوچھو محرم تماشا ہے
بیٹھا ہوا دنیا میں اُٹھ جائے جو دنیا سے

جس معاشرہ کو صدیوں سے اِس قِسم کی غم آلود اور اَلم انگیز ماتمی فضا میں رکھا گیا ہو اُس کے لئے ضروری نہیں کہ حالات یاس انگیز ہوں تو وہ مایوس ہو۔ مایوسی اُس کے خمیر میں رچ چکی ہوتی ہے۔ نوحہ گری اُس کا معمول بن جاتی ہے۔ فرق صرف اِتنا ہوتا ہے کہ کبھی وہ دھیمے سروں میں ہوتی ہے اور کبھی اونچے سروں میں، جیسا کہ آج کل ہو رہا ہے۔

سوال یہ ہے کہ انسان یاس و حُزن میں لذّت کیوں لینے لگ جاتا ہے۔ جواب بالکل واضح ہے جب کوئی شخص یہ کہہ دے کہ "اب کچھ نہیں ہو سکتا" تو اس کے بعد نہ اُس پر کوئی ذمہ داری عائد ہوتی ہے نہ

اُسے کچھ کرنے کے لئے کہا جا سکتا ہے لہٰذا مایوسی خارجی حالات کی نامساعدت کی پیدا کردہ نہیں ہوتی یہ ذمہ داری سے جی چرانے کا بہانہ ہوتی ہے۔ یہ زندگی کے حقائق سے فرار (ESCAPISM) کیلئے (JUSTIFICATORY REASONS) وجہِ جواز ہوتی ہے۔ وجہِ جواز کیا ہوتی ہے خود فریبی (SELF - DECEPTION) ہوتی ہے۔ ایسی قوم کو حالات ہلاک نہیں کرتے وہ اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو خود ہلاک کر لیتی ہے اِسے اجتماعی خودکشی کہتے ہیں۔ خودکشی کرنے والے کے متعلق عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ وہ بڑا بہادر ہوتا ہے کیونکہ وہ موت سے نہیں ڈرتا۔ وہ موت سے ڈرتا ہے یا نہیں اِس کے متعلق تو میں کچھ نہیں کہنا چاہتی البتہ پورے حتم و یقین کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ وہ زندگی سے ضرور ڈرتا ہے۔ یہی کیفیت خودکشی کرنیوالی یعنی مایوس قوموں کی ہوتی ہے وہ زندہ رہنے سے ڈرتی ہیں۔ وہ زندگی کے حقائق کا سامنا نہیں کرنا چاہتیں اور بجائے اس کے کہ اسے کا کھلے بندوں اعتراف کریں۔ اِسے الفاظ کے خوش نگاہ فریب پردوں میں چھپانا چاہتی ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ آج کل ہر شخص یہ کہے گا کہ "کچھ بھی نہیں ہو سکتا" اتنا کہنے کی کوئی جرأت نہیں کرے گا کہ "میں کچھ نہیں کر سکتا" اور یہ نتیجہ ہے اُس میٹھے زہر کا۔ جو ہمیں شعر و نغمہ کے بلوریں آبگینوں اور کلچر اور لٹریچر کے یاقوتی پیمانوں میں صدیوں سے پلایا جا رہا ہے۔ ہمارے پیامبرِ حیات اور سرفے نواز امید، اقبالؒ نے قوم کو اِس سحرِ سامری کی مدہوشی سے بیدار کرنے کی کوشش کی۔ اُس نے کہا اور پورے جوش و خروش سے کہا کہ یاد رکھو۔

شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو　　　جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا
بے معجزہ دُنیا میں اُبھرتی نہیں قومیں　　　جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہُنر کیا

قوم نے اِس نشیدِ حیات آور سے کروٹ بدلی جس کا نتیجہ مملکتِ پاکستان کا قیام تھا۔ لیکن اِس کے بعد پھر منہ موڑ کر سو گئی اور پھر ہماری بے حسی کا یہ عالم ہو گیا کہ اگر آدھا ملک ہم سے چھن گیا تو کیا؟ اور اگر پیاز بجائے آنے کی بجائے ۴ روپے سیر ہو گیا تو کیا؟ اِن میں سے کوئی حادثہ بھی ایسا نہیں جو ہمیں جاگنے پر آمادہ کر سکے۔ یعنی ہمارے کاروانِ ملت کا متاع ہی نہیں لٹا کارواں کے دل سے احساسِ زیاں بھی جاتا رہا ہے۔ اور یہ بے حسی مادی ساز و سامان تک ہی محدود نہیں رہی۔ زندگی کی وہ بلند اقدار جو انسان کو حیوان سے متمیز کرتی ہیں ہم سے چھن گئیں اتنا ہی نہیں کہ ہمیں ان کے لٹنے کا کوئی غم نہیں ہوا۔ ہمیں ان کی قدر و قیمت پر ہی کوئی یقین نہیں رہا۔ پہلے اگر کوئی کسی معاملہ میں بددیانتی کرتا تھا تو اُسے اِس پر ندامت ہوتی تھی۔ اب بددیانتی کرنے والا دھڑلے سے کہتا ہے کہ دیانتداری میں رکھا ہی کیا ہے؟ یہ پُرانے زمانے کی باتیں ہیں۔ اصل مقصد تو کامیابی ہے وہ جس طریق سے بھی حاصل ہو جائے۔ پہلے اگر کوئی شخص جھوٹ بولتا تھا۔ تو اس کا پول کھل جانے پر وہ لوگوں کو منہ نہیں دکھاتا تھا۔ اب جھوٹ بولنا ایک فن ہو گیا ہے جو اس میں زیادہ ماہر ہو وہ سب سے زیادہ کامیاب ہوتا ہے۔ اب دیانت۔ امانت۔ صداقت۔ شرافت، ایفائے عہد، سب فرسودہ روایات بن چکی ہیں اور کسی کو اس کا احساس نہیں کہ یہ کتنی عظیم متاع تھی جس سے ہم محروم ہو گئے ہیں۔ یہ بے حسی کی انتہا ہے اور بے حسی درحقیقت بے عملی کا بہانہ ہوتی ہے۔ یا یوں کہیئے کہ بے عملی کی انتہا بے حسی اور بے حسی کی انتہا مایوسی ہوتی ہے۔

جیسا کہ میں نے شروع میں کہا تھا نوحہ گری اور مرثیہ خوانی ہمارے مزاج میں داخل ہو چکی ہے۔ اگر ہم فضا پر چھائی ہوئی مایوسی کو ختم کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لئے قوم کے اس مزاج کو بدلنا ہوگا۔ اور قوموں کا مزاج صحیح تعلیم و تربیت سے بدلا جاتا ہے۔ اس تبدیلی سے اس قوم کے سامنے زندگی کا بلند مقصد آ جاتا ہے اور مقصدیت مایوسی کو پاس نہیں پھٹکنے دیتی۔ اس سلسلہ میں مجھے جرمنی کے مشہور مفکر نیٹشے کا وہ واقعہ یاد آ جاتا ہے۔ جو بڑا ہی سبق آموز ہے۔ وہ جوانی کے عالم ہی میں تپ دق کا شکار ہو گیا تھا لیکن اس کے باوجود وہ اپنے کام میں بدستور منہمک رہا۔ اس کے بیوی بچے نہیں تھے۔ صرف ایک بہن تھی جو اس کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ اس نے ایک دن انتہائی مایوسی کے عالم میں کہا کہ میں دیکھ رہی ہوں کہ موت کس قدر تیزی سے تمہاری طرف بڑھ رہی ہے۔ میں حیران ہوں کہ تمہارے بعد یہ کام کون کرے گا۔ نیٹشے نے یہ سنا تو بہن سے کہا کہ پگلی! فطرت تمہارے جیسی بے وقوف نہیں کہ وہ مجھے اس کام کی تکمیل سے پہلے ہی موت کے ہاتھوں میں دے دے۔ جس کام کے متعلق وہ جانتی ہے کہ میرے بعد اسے کوئی نہیں کر سکے گا۔ میں اپنی اس آخری کتاب کی تکمیل تک ضرور زندہ رہوں گا۔ اور وہ اس کی تکمیل تک زندہ رہا۔ مقصدیت یہ کچھ کیا کرتی ہے۔ اس سے نونہالان قوم کے اندر عقابی روح بیدار ہو جاتی ہے اور

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے اس کو اپنی منزل آسمانوں میں

اور ایسے باعزم نوجوانوں پر مشتمل قوم کا خود مایوس ہونا تو کجا، وہ دنیا کے ہر مایوس انسان کو جھنجھوڑ کر کہتی ہے کہ:۔

نہ ہو نومید، نومیدی زوالِ علم و عرفاں ہے
امیدِ مردِ مومن ہے خدا کے رازدانوں میں

کراچی میں

ادارہ طلوع اسلام کی مطبوعات حاصل کرنے کے لئے

دفتر بزم طلوع اسلام کراچی سے رابطہ قائم کریں۔

پتہ:- دار القائد ۲۰-۱/بی ناظم آباد نمبر ۳ (بس سٹاپ ۲) کراچی ۱۸ - فون ۲۱۴۴۶۰